صلیبِ عشق

ہاشم ندیم



فہرست

رین کوٹ (نظم)

(Rain Coat)

دیکھو پھر سے......

خزاں کی پہلی جھڑی ہے......

اور میں......

اس ویران ریلوے اسٹیشن کے

تنہا بینچ پر گم سم بیٹھا......

جانے کب سے بھیگ رہا ہوں

سرخ، زرد گرتے پتوں کی چادر

میرے وجود کو ڈھانپنے کی

ناکام کوشش میں......

میرے قدموں میں بکھرتی جا رہی ہے

ٹھنڈی، بھیگی اور سرسراتی ہوا......

میری نم آنکھوں کو چھو رہی ہے......

میرے ہاتھ میں......

خشک گلاب کی چند پتیاں ہیں

جو صبح رین کوٹ پہنتے ہوئے

میری جیب سے گر گئیں تھیں......

تمہیں یاد تو ہوگا نا

چند سال پہلے......

جب ہم ابھی بچھڑے نہ تھے......اور

خزاں کی ایک ایسی ہی گلابی شام میں

جب برستی بوندوں نے ہمیں گھیر لیا تھا

تب تمہیں گھر چھوڑتے وقت، واپسی پر

میں نے یہ رین کوٹ

تمہارے لرزتے، کانپتے شانوں پر ڈال دیا تھا......

اگلے دن تمہارا پیامبر

یہ رین کوٹ تو واپس کر گیا......

پر جاتے جاتے یہ مژدہ بھی سنا گیا......

کہ تم اس رین کوٹ کی جیب میں لگے

اس گلاب کی پتیاں خشک ہونے سے پہلے

لوٹ آؤ گی......

تب سے خزاں کی یہ بھیگتی شام

میں یہ رین کوٹ، کاندھوں پر ڈالے

اور یہ چند خشک پتیاں ہاتھوں میں لیے

تمہارے انتظار میں......

اس ٹھٹھرتے پلیٹ فارم پر آبیٹھتا ہوں

لیکن شاید تمہیں

یہ مرجھائی ہوئی چند خشک پتیاں

اب یاد بھی نہ ہوں گی......

اور اس بھیگتی شام میں

تمہارے کومل ہاتھ

کسی اور کے رین کوٹ کے کالر میں

کوئی تازہ گلاب

سجا رہے ہوں گے......

(ہاشم ندیم خان)



"پری زاد" (افسانہ)

مائیں عام طور پر اپنے سب سے کم رو بچے کا سب سے زیادہ خوبصورت نام رکھتی ہیں۔ شاید وہ اس نام کے ذریعے اپنے جگر گوشے کی کمزوریاں چھپانے کی ایک آخری لیکن ناکام کوشش کرتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ پری زاد کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ ایک غریب کلرک کے گھر میں پیدا ہونے والا ساتواں بچہ تھا۔ گہرے سانولے رنگ کا ایک کمزور سا مریل بچہ..... جو شروع کے سات آٹھ دن وارڈ کے انکیوبیٹر میں مشین کے سہارے زندہ رہا اور گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود پرانے بچوں کی گنتی میں صرف ایک اضافے کے طور پر گنا جاتا تھا۔ اُس کے ماں باپ اسے پیدا کرنے کے دو تین سال بعد اُسی طرح بھول گئے جیسے وہ اُس سے پہلے کے چھ بچوں کو بھلا چکے تھے۔ غریب کو ویسے بھی مہنگائی اپنے سوا مزید کوئی اور چیز یاد ہی کہاں رہنے دیتی ہے؟ سو پری زاد کا باپ بھی باقی سب کچھ بھلا کر اُن کے پیٹ کا جہنم بھرنے کی فکر میں لگا رہتا اور ماں عمر بھر بچوں کا بچا کھاتی ......اور چار جوڑوں کے کپڑے میں سے سات جوڑے بنانے کی دُھن میں جتی رہی۔ اُسے بھلا بچوں کی تربیت کا خیال کہاں سے آتا؟ ویسے بھی غریب گھرانوں کے بچے اپنی تربیت خود آپ کرتے ہیں.....ان کی گلی، محلہ اور سڑک ان کی پہلی تربیت گاہ ہوتی ہے اور ٹاٹ والا اسکول دوسری درس گاہ۔ پری زاد کو بھی پانچ سال کی عمر میں ایک ایسے ہی ٹاٹ والے سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ وہاں اس کے ہم جماعت اور اساتذہ کو جب اس کا نام پتہ چلتا تو وہ زیرِ لب مسکرا دیتے، کچھ بدتمیز بچے باقاعدہ قہقہے لگا کر ہنستے لیکن پری زاد کے پاس اپنے نام کا کوئی نعم البدل موجود نہیں تھا۔ قدرت نے اُسے ایک غریب گھرانے میں اور کم شکل پیدا کر کے اتنا بڑا ظلم نہیں کیا کیونکہ ایسے ہزاروں لاکھوں بچے ایسے گھرانوں میں پیدا ہوتے اور پل کر

جوان ہوتے رہے ہیں۔ پری زاد کے ساتھ مقدر کا اصل مذاق اُس کے اندر پلتا اس کا انتہائی حساس اور نازک دل تھا۔ کاش انسان کے سینے میں دھڑکتا دل بھی اس کی حیثیت اور شکل وصورت کی مناسبت سے حساس یا بے حس ہوتا تو دنیا کتنی آسان جگہ ہو جاتی ہم سب کے رہنے کے لیے...... لیکن یہ جہاں کم ہی خوش نصیبوں کے لیے سہل ہوتا ہے اور پری زاد اُن میں شامل نہیں تھا۔ ایک اور ستم یہ ہوا کہ پانچویں جماعت میں بداحتیاطی اور وقت پر ٹیکہ نہ لگانے کی وجہ سے اُسے چیچک ہوگئی اور جنم سے گہرا سانولا چہرہ چیچک کے داغوں سے مزید دھندلا گیا۔ وہ پہلے تنہا تھا، اب تنہا تر ہوتا چلا گیا۔ مقدر کے مذاق یہیں ختم نہیں ہوئے۔ لڑکپن آتے ہی پری زاد کو حقیقت کا ادراک ہونے لگا کہ نصیب نے اُسے ایک حسن پرست دل سینے کے پنجرے میں بند کر کے سونپ دیا ہے۔ عورت کی خوبصورتی اور حسن اس کے اندر ایک عجیب سا تلاطم پیدا کر دیتا تھا۔ اس کی نظریں غیر محسوس طور پر دل فریب چہروں کو اپنے آس پاس تلاشتی رہتیں اور نظر آ جانے کی صورت میں وہ غیر شعوری طور پر اُسی دل کش چہرے کے گرد چکر کاٹتا رہتا تھا لیکن ایک بدصورت چیچک زدہ صورت کی موجودگی اپنے آس پاس بھلا کون محسوس کرنا چاہے گا؟ سو پری زاد بھی ایسی ہی محفل میں غیر محسوس شدہ رہتا اور اگر کبھی غلطی سے کسی کی نظر اس پر پڑ بھی جاتی تو سوائے چند معنی خیز مسکراہٹوں اور تضحیک آمیز فقروں کے اُس کے حصے اور کچھ نہ آتا۔ مگر پری زاد اپنے اندر دھڑکتے اُس من چلے کا کیا کرتا جو ہر بار پھر اُسی محفل میں جانے کی ضد کرتا جہاں سے ہمیشہ اسے صرف دھتکار ہی ملی تھی۔

پری زاد نے اپنے دل کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ حسن اور روپ کا یہ امرت اُس کا نصیب نہیں لیکن ''نادان'' بھلا کب سمجھے ہیں اور دل کس کا دوست ہوا ہے؟ دشمن اگر نادان بھی ہو تو دشمنی رسوا ہو جاتی ہے۔ پری زاد بھی اپنے دل کی دشمنی کو جھیل رہا تھا۔ دل تو شاید کبھی اس پر ترس کھا بھی لیتا مگر اس کے اندر چھپا بیٹھا وہ ایک موسیقار بڑا بے رحم تھا۔ لڑکپن شروع ہونے سے پہلے ہی پری زاد کو ایک عجیب سا ادراک ہوا کہ اس کی روح کے تار موسیقی کی مدھر تانوں سے بے تحاشہ بجنے لگتے ہیں۔ مختلف میلوڈیز اُسے ہر بار ایک نئے جہاں میں لے جاتیں اور وہ اپنی ظاہری بدصورتی کو بھول کر چند لمحوں کے لیے ان رس گھولتی ساعتوں کے دھاگے تھام کر شہزادہ بن جاتا ہے۔ اس کے آس پاس پریوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا اور وہ راجہ اندر بنے ان سب کے درمیان بے نیاز سا گھومتا رہتا ہے۔ موسیقی سن کر کبھی وہ اپنے اسکول کا بہترین مقرر بن جاتا اور سارا ہال اس کی جوشیلی تقریر سن کر تالیاں پیٹ پیٹ کر آسماں سر پر اٹھا لیتا۔ کبھی وہ کھلاڑی بن کہ آخری لمحوں میں اپنی ٹیم کو جیت دلا دیتا اور کبھی کسی جنگ کے میدان میں کشتوں کے پشتے لگاتا ہوا اپنی محبوبہ کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر لے جاتا...... لیکن جیسے ہی موسیقی یا نغمے کی وہ میٹھی تان ختم ہوتی، پری زاد اپنی حقیقت کی مکروہ دنیا میں واپس پہنچ جاتا۔ بچے زیادہ ہوں تو ماں باپ اُن کی حساسیت کے پیمانے غلط ملط کر بیٹھتے ہیں۔ اور صرف ان کی عقل کی

سکول نہیں پڑھتے ہیں۔ اور عموماً ان حالات میں سب سے بڑا بچہ اور پھر ترتیب وار اس کے بعد باقی چھوٹے بچے والدین کے حساب سے زیادہ عقل مند ٹھہرائے جاتے ہیں اور اسی ترتیب اور حساب سے گھر میں انہیں اہمیت بھی دی جاتی ہے۔ اس کلیے سے پری زاد اپنے ماں باپ کی اہمیت کی فہرست میں سب سے آخر میں آتا تھا بلکہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے اہمیت عموماً ختم ہو جاتی تھی۔ پری زاد آٹھویں جماعت میں تھا جب اُس نے پہلی مرتبہ کسی کو پیانو بجاتے دیکھا۔ اسکول کی ایک تقریب میں ملی نغموں کے مقابلے کے لیے ان سب کو کسی انگریزی میڈیم اسکول لے جایا گیا اور وہاں ایک پیاری سی ٹیچر کو پری زاد نے پیانو کے تار چھیڑتے دیکھا تو اس کے من کے تار بھی بج اُٹھے۔ پری زاد کو پہلی نظر میں ہی اس ٹیچر سے محبت ہوگئی جس کا نام بھی اُسے معلوم نہیں تھا اور اُسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ دنیا میں صرف پیانو بجانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ تقریب ختم ہوگئی لیکن پری زاد کی روح کے اندر بجا پیانو کبھی بند نہیں ہوا۔ اس نے دوبارہ کبھی اُس من موہنی پیانو بجانے والی اُستاد کو نہیں دیکھا مگر وہ عمر بھر پری زاد کے اندر پیانو بجاتی رہی۔ دسویں کے بعد اُس نے ڈرتے ڈرتے اپنے باپ سے پیانو کی فرمائش کی تو اُسے زوردار ڈانٹ کے ساتھ بے ہودہ مشاغل سے دور رہنے کی ہدایت کی گئی۔ حالانکہ اُس نے صرف شہر کے عیسائی محلے میں ایک اُستاد سے سارے دن میں صرف ایک گھنٹے کی کلاس لینے کی درخواست کی تھی۔ مجبوراً پری زاد کو اپنے اندر کی مدھر تانوں بھری دنیا سے ناطہ جوڑنا پڑا۔ ان دنوں اُس کے محلے کی ایک حسینہ، ناہید کا بڑا چرچا تھا، جس کی لٹ کے ایک بل پر ہزار قدموں کی راہیں مڑ جاتی تھیں اور جس کے ابرو کا ایک خم ہزار دلوں کی دھڑکن پلٹ سکتا تھا۔ پری زاد بھی اُس کی ایک ترچھی نظر کا شکار مگر وہ اپنی کم مائیگی اور محدودیت سے واقف تھا لہٰذا اُس نے صرف اپنی نظر کو ناہید کے سراپے کو نہارنے کی اجازت دی لیکن اُس کی زبان ہمیشہ جبڑے کے پیچھے پابند سلاسل رہی۔ مگر ایک دن کچھ عجیب واقعہ ہوا۔ پری زاد کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس کی بڑی بہن نے آکر اُسے بتایا کہ باہر صحن میں ناہید کھڑی اس کا پوچھ رہی ہے۔ پری زاد کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ جانے وہ کس طرح ہمت جتا کر ناہید کے سامنے پہنچا۔ ناہید کے ہاتھ میں میٹرک کی اُردو کی کتاب تھی اور وہ پری زاد سے اپنے آنے والے بورڈ کے امتحانات کی تیاری کے لیے چند غزلوں کی تشریح کروانے کے لیے آئی تھی۔ پری زاد کو زندگی میں پہلی مرتبہ اُردو زبان پر بے تحاشہ پیار آیا اور اپنی اُردو میڈیم پڑھائی کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اُس نے ناہید کو تو سمجھا دیا پر اپنے دل کی ساری غزلوں کی تشریح بھول گیا۔ کئی دن تک تو اُسے یقین ہی نہیں آیا کہ ناہید اس کے روبرو بیٹھی ہوئی اس سے باتیں کر رہی تھی اور اُس کی کہی سن رہی تھی۔ کتنی خوبصورت آنکھیں تھیں ناہید کی، سرمئی جھیلوں جیسی ...... چمکیلی ...... روشنی بھری ...... گلابی عارض پر ڈھلتی ارغوانی شام کی شفق جیسی ہلکورے لیتی ہوئی ...... بولتی ہوئی آنکھیں ...... ان چند لمحوں کا خمار کئی دن تک پری زاد کے حواس پر چھایا رہا...... لیکن پھر ایک دن محلے میں جنم لیتی ایک افواہ نے پری

زاد کے اندر کی تانوں کو پھر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ناہید کی چھت پر رات کے اندھیرے میں کسی ''چوکنے'' محلے دار نے ناہید کو محلے کے سب سے گبھرو اور گورے چٹے نوجوان ماجد کی بانہوں میں لپٹے دیکھ لیا تھا۔ محلے کے بزرگ اس حادثے پر سر پیٹ رہے تھے اور جوان سوگ مناتے رہے لیکن پری زاد کو ایک عجیب سی اُداسی نے آ گھیرا۔ وہ دل ہی دل میں ناہید کو اپنے اندر کی دنیا کی شہزادی کا درجہ دے چکا تھا اور ناہید کی اس ''بے وفائی'' پر اس کا دل یوں ٹوٹا جیسے کوئی محبوبہ رقیب کے ساتھ چل دی ہو۔ اُس کا نادان دل کبھی سمجھ ہی نہیں پایا کہ حسینوں کو سدا حسین ہی بھاتے ہیں۔ اُس جیسے بدصورت کی وہاں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ پر مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ بیرونی دنیا کے آئینے کم ہی دیکھتا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کے اندر اس کے من کا آئینہ بھی تو لگا ہوتا ہے جس میں دنیا کی سب سے خوبصورت، پاک اور شفاف ہماری اپنی صورت اور ہماری ذات ہوتی ہے۔ ہم چوبیس گھنٹے اسی من کے سندر آئینے میں خود کو دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ وہ آئینہ ہمیں ہمارا اپنا آپ بدصورت نہیں دکھاتا مگر افسوس بیرونی دنیا کے آئینے کا سچ ہمیشہ اندر کی صورت کے مخالف ہوتا ہے کاش بیرونی دُنیا کے یہ کرخت آئینے بھی ہمیں ہمارے اندر کے آئینوں جیسا روپ دکھاتے تو دنیا کتنی خوبصورت ہوتی۔ اپنے اندر کے آئینے نہارنے والوں کا باہر کے آئینوں سے سدا جھگڑا رہتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ پری زاد کے ساتھ بھی تھا۔ لیکن اندر کی خوبصورت پرکھنے والی نظر یہاں کس کے پاس ہے......؟ دنیا تو ظاہری روپ پر مرتی اور پری زاد جیسے گھائلوں کو ہمیشہ ''نرگسیت'' کے طعنے دیتی رہتی ہے۔ پری زاد جب بھی کبھی اپنے اندر کے آئینے کے سامنے سج سنور کر خوبصورت کپڑے پہن کر، سیدھی مانگ نکال کر اور اپنی آنکھوں میں روشنی بھر کے اپنے نام کی طرح پری زاد بن کر باہر کی دنیا میں نکلتا تو کسی نہ کسی کی نظر کا آئینہ اور لفظوں کے زہر میں بجھے تیر اُسے اس مکروہ حقیقت سے آشنا کر ہی دیتے کہ وہ باہر کی دنیا میں ایک قابل نفرت و حقارت، کرخت چہرے کا مالک ہے..... کاش، خدائی ہمارے اندر لگے یہ آئینے نہ بناتی...... یا پھر بیرونی دنیا کے یہ سبھی شیشے چکنا چور کر دیتی۔ پری زاد باہر کے آئینے تو نہ توڑ سکا پر اُس کے اندر کا کانچ روزانہ ٹوٹتا رہا۔ یہ نادان دنیا والے اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ باہر لگے سبھی آئینے ہم سے جھوٹ بولتے ہیں۔ ہمیں ہمارے عکس کی اُلٹی شبیہہ دکھاتے ہیں۔ روشنی اور اندھیرے کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہم سب ان آئینوں میں نظر آنے والی تصویر سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دل کش ہوتے ہیں مگر ہماری مجبوری ہماری نظر میں جھلملاتا عکس ہوتا ہے اور ہم اُسی پر اعتبار کر کے خوبصورتی یا بدصورتی کے معیار کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

کالج ختم ہوا اور یونیورسٹی کی ابتدا ہوئی۔ پری زاد کے دل میں پلتا برسوں کا ایک خواب پورا ہو گیا اور وہ مخلوط تعلیمی ادارے تک پہنچ گیا۔ اس کی جماعت میں تقریباً چالیس لڑکیاں پڑھتی تھیں جن میں کم سے کم نصف ایسی تھیں کہ جن کا شمار مہ رخوں میں کیا جا سکتا تھا، مگر لبنیٰ ان سب کی ملکہ تھی۔ پری زاد، ظاہری طور پر خود بد

صورت ہونے کے باوجود اپنے اردگرد معمولی سی بدصورتی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ حسن پرستی صرف لڑکیوں کی حد تک ہی نہیں تھی بلکہ اُسے ہر بدصورت چیز سے نفرت تھی اور ناہید کے تجربے نے پری زاد کو اتنا تو سکھا ہی دیا تھا کہ صنفِ نازک کی قربت کا ایک دروازہ شاعری اور ادب سے ہو کر بھی گزرتا ہے۔ لہٰذا اس نے یونیورسٹی کی بزمِ ادب کی صدارت حاصل کرنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ چھوٹے موٹے شعر تو وہ میٹرک کے بعد ہی جوڑنے لگا تھا اب سنجیدگی سے اُس نے اس جانب توجہ دی تو جلد ہی اندھوں میں کانا راجہ ہو گیا۔ ویسے بھی اردو کے مضمون میں وہ ہمیشہ سب سے زیادہ نمبر لیا کرتا تھا لہٰذا جلد ہی اُسے یونیورسٹی کی تمام ادبی سرگرمیوں کا لازمی حصہ سمجھا جانے لگا اور ایسے موقعوں پر جب کبھی لبنیٰ اس کے ساتھ اسٹیج یا کلاس کے ڈائس پر آ کر شانہ بشانہ کھڑی ہوتی اور جماعت کے دوسرے لڑکے حسرت بھری نظروں سے لبنیٰ کو گھورتے تو پری زاد کا سینہ فخر سے چوڑا ہو جاتا تھا۔ لبنیٰ کافی آزاد خیال اور ہنس مکھ لڑکی تھی اور اُسے اپنے حسن کی چکا چوند کا بھی خوب اندازہ تھا۔ اس لیے یونیورسٹی کا جب کوئی دل پھینک لڑکا اس کے قریب آنے کی کوشش میں ناکام ہو کر ٹھنڈی آہیں بھرتا تو وہ خوب ہنستی اور پری زاد کو بھی ان ناکام عاشقوں کی کہانیاں مزے لے کر سناتی۔ اور جواب میں پری زاد صرف مسکرا کر رہ جاتا۔ اب وہ لبنیٰ کو کیا بتاتا کہ اُس کا سب سے بڑا ''عاشق نامراد'' تو وہ خود ہے۔ پری زاد کے ساتھ ایک ستم یہ بھی تھا کہ اس کی بدصورتی کی وجہ سے اس کی جماعت کی سبھی لڑکیاں اُسے ''بے ضرر'' سمجھتی تھیں۔ وہ ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے ان سب لڑکیوں کے لیے قابلِ احترام اور ہر دل عزیز دوست تو ضرور بن چکا تھا لیکن اُس کا درجہ لڑکیوں کے نزدیک صرف ایک ''کم رو سہیلی'' کا تھا، ایک ایسی سہیلی جو اچھی رازدار تو بن جاتی ہے مگر اپنی کم شکلی کی وجہ سے کسی خطرے کا باعث نہیں بن سکتی تھی۔ یوں پری زاد اُن مہ جبینوں کے قریب تو ہو گیا لیکن اس کے دل کا کنول سدا مرجھایا ہی رہا۔ یونیورسٹی کے آخری سال تک پری زاد نئی نسل کا ایک اچھا شاعر مانا جانے لگا تھا۔ لڑکیاں اُس کے شعر اپنی بیاض اور ڈائری میں نوٹ کر کے رکھا کرتی تھیں اور اس کا احترام بڑھ چکا تھا۔ لیکن ایک دن یہ بھرم بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ یونیورسٹی کے سالانہ مشاعرے کے اختتام پر جب ہال خالی ہو چکا تھا۔ پری زاد اسٹیج سیکرٹری سے اپنی کتاب واپس لینے کے لیے ہال کے اندر داخل ہوا تو پردے کے پیچھے کچھ لڑکیاں اُس شام کے کامیاب مشاعرے پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ ان میں لبنیٰ کی آواز بھی شامل تھی۔ پری زاد کے قدم اپنا نام سن کر خود بخود رک گئے۔ اس کی آمد پردے کے پیچھے والیوں سے پوشیدہ تھی۔ پہلی لڑکی بولی۔ ''واہ بھئی..... مزہ آ گیا..... آج کی شام ہمیشہ یاد رہے گی..... پری زاد کیا شعر کہتا ہے۔ لگتا ہے جگر ہاتھوں میں مچل رہا ہو.....'' دوسری نے تائید کی ''ہاں بھئی..... سچ ہے..... اس کے شعر دل میں آگ لگا دینے والے ہوتے ہیں..... خاص طور پر جب وہ لبنیٰ کے چہرے کی طرف دیکھ کر شعر کہتا ہے'' سب لڑکیاں زور سے ہنس پڑیں۔ جواب میں لبنیٰ کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی ''بکو مت..... وہ بے چارا اپنی

اوقات جاننا ہے...... میں اُس کے اندر کے شاعر کی قدر ضرور کرتی ہوں...... لیکن کاش یہ پھول انگلش ڈیپارٹمنٹ کے خالد کی زبان سے میری شان میں جھڑتے تو میں تو وہیں فدا ہو جاتی...... ہائے...... کیا شخصیت ہے...... میں حور ہوں تو وہ شہزادہ......'' لبنیٰ کی بات پر سبھی سہیلیوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور اُن میں سے ایک بولی ''ہاں...... مگر جب وہ پری زاد اسٹیج پر تمہارے ساتھ کھڑا ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے پہلوئے حور میں لنگور'' ...... قہقہے بلند ہوتے چلے گئے اور پری زاد کو یوں لگا جیسے اس کے اندر بیٹھے شہزادے کے دل میں بیک وقت کئی خنجر گھونپ دیئے گئے ہوں۔ وہ مزید وہاں رُک نہ سکا اور پھر اُس نے کبھی دوبارہ یونیورسٹی کا رُخ نہ کیا۔ اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ماں باپ یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہوگئے اور بہن بھائیوں کی شادیاں ہوگئیں اور سبھی اپنی اپنی دُنیا میں مگن ہوگئے۔ پری زاد مزید تنہا ہوگیا۔ تنہائی صرف آس پاس کے لوگوں کے دور ہو جانے کا ہی تو نام نہیں...... کبھی کبھی شدید بھیڑ اور بہت بڑے ہجوم میں بھی ہم تنہا ہوتے ہیں۔ اصل تنہائی شاید ہمارے اندر پلتی ہے۔ پری زاد بھی اس دوہری تنہائی کے عذاب کا شکار تھا۔ بیرونی دنیا میں اس کا کوئی سچا دوست نہیں تھا اور اس کے اندر کا پری زاد کسی پری کی رفاقت کے لیے ترستا رہتا تھا۔ تب کسی نے اُسے خلیج جا کر قسمت آزمانے کا مشورہ دیا۔ ان دنوں دوبئی میں مزدور کی بڑی مانگ تھی۔ پری زاد بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پیسہ کمانے کی دھن میں دوبئی آ گیا۔ مقصد اپنے اندر کی تنہائی سے چھٹکارا پانا بھی تھا۔ اور ساتھ ہی اس کے اندر کا پری زاد اب تک یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ شاید بے تحاشہ پیسہ اسکی ظاہری بدصورتی پر پردہ ڈال دے گا اور پھر نازنینائیں اس کی رفاقت میں شرمندگی محسوس نہیں کریں گی۔ تب وہ بھی کسی شہزادی کو چن کر اپنا گھر بسا لے گا۔

پری زاد اپنی محنت اور ایمان داری کی بدولت جلد ہی فورمین کے عہدے پر فائز ہوگیا۔ اس کا کمپنی کے ساتھ تین سال کا معاہدہ دس سال سے زیادہ پر محیط ہوگیا اور اس کے پاس پیسے کا انبار لگتا گیا لیکن پری زاد کے اندر کسی کا محبوب بننے کی پلتی خواہش کبھی نہ مر سکی۔ وہ جانتا تھا کہ کسی کا محبوب بننا کتنا بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ ایک ایسی بادشاہی جس کے لیے شہنشاہ اپنا تخت و تاج لپیٹ کر چل دیتے ہیں کہ جو کسی کے محبوب کی مسند پر فائز ہو جائے پھر بھلا اُس کے لیے بادشاہی کا معمولی تخت کیا اہمیت رکھتا ہے؟ پر افسوس یہاں ایسے بھی کئی نادان ہیں جنہیں محبوبیت کے اعزاز کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہو پاتا اور وہ تمام عمر خود کسی کا محبوب ہوتے ہوئے بھی اپنے لیے کسی دوسرے محبوب کی تلاش میں اپنی زندگی بتا دیتے ہیں۔ محبوب کو بھلا محبوب کی کیا ضرورت......؟...... اصل المیہ تو اُن کا ہے جو نہ خود محبوب ہوتے ہیں اور نہ کوئی ان کا دلبر ہوتا ہے۔ جیسے پری زاد...... دوبئی میں پندرہ سال دن رات اپنا پسینہ بہانے کے بعد فورمین پری زاد، سیٹھ پری زاد بن کر وطن واپس لوٹا تو اس کے استقبال کے لیے پورا خاندان ائیر پورٹ پر موجود تھا۔ وہ غیر اہم اور معمولی لڑکا اب پکی عمر کا دولت مند اور شہر کا معزز فرد بن چکا تھا۔ مگر اس کے دل کا نگر اب بھی خالی تھا۔ اس نے ملک کے سب سے بڑے صنعتی شہر میں تعمیرات کی ایک

بہت بڑی کمپنی کھولی اور اپنے اردگرد خوبصورت چہروں کا ایک ہجوم اپنے اسٹاف کی صورت جمع کر لیا۔ خوبصورت عورتیں اس کی کمزوری بنتی چلی گئیں لیکن خریدی ہوئی وفا کبھی محبت کی سرحد پار نہ کر سکی۔ پری زاد کے پیسے کی چمک نے بہت سے معشوق اس کے گرد جمع تو کر دیئے مگر اُس کی محبوب بننے کی حسرت پوری نہ ہو سکی۔ پری زاد کا مسئلہ کسی جسم کا حصول ہرگز نہیں تھا۔ اُسے تو بس دل سے چاہے جانے کی پیاس تھی مگر دولت کے پیچھے بھاگتی دلکش عورتیں کبھی یہ راز نہ جان سکیں۔ پری زاد کو ان کی چاہت کا کھوٹ پہلی نظر میں ہی دکھائی دے جاتا تھا۔ وہ بظاہر پری زاد کی شان میں قصیدے پڑھتی رہتی تھیں مگر تنہائی میں وہ اس کے سراپے کا مذاق اُڑاتیں۔

پری زاد کے اندر کا جھوٹا اور بناوٹی شاعر اب ایک سچا اور پکا شاعر بن چکا تھا مگر اب پری زاد اپنی شاعری کم ہی کسی سے بانٹتا تھا۔ بظاہر اس نے خود کو ادب کی دنیا سے جوڑے رکھنے کے لیے شہر کی تمام بڑی ادبی تنظیموں کی رُکنیت اختیار کر رکھی تھی اور ان میں سے کئی خود اس کی اپنی سرپرستی میں بھی چلتی تھیں۔ وہ بے تحاشہ اپنا پیسہ ان سرگرمیوں پر لٹاتا تھا۔ شاید اہم نظر آنے کی لت نے اب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا مگر اب بھی وہ غیر محسوس طور پر صرف ان تقریبات میں ہی شرکت کی ہامی بھرتا تھا جن میں اُسے اچھے چہرے دکھائی دینے کی کچھ اُمید ہوتی اور پھر ایک ایسی ہی تقریب میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے آگے چل کر اس کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔

کسی نئی شاعرہ کی کتاب کی تقریب رونمائی میں جب وہ بطور صدر محفل اپنی تقریر ختم کر کے واپس پلٹنے لگا تو میزبان محفل نے پری زاد سے اس کا کچھ ذاتی کلام سننے کی فرمائش کر دی۔ اور پھر اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود تمام شرکاء اس فرمائش کے درپے ہو گئے۔ مجبوراً پری زاد کو اپنی ایک تازہ غزل سنانی پڑی جس میں ہمیشہ کی طرح اس نے اپنے اندر کے پری زاد کی ازلی تنہائی اور اپنی روح پر لگے زخموں کا ذکر کیا تھا۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا لیکن ایک تالی تھی جو سب کے خاموش ہو جانے کے بعد بہت دیر تک ہال میں گونجتی رہی۔

وہ گل رُخ تھی...... اپنے نام کی طرح تازہ گلاب کی کسی پنکھڑی جیسی کومل اور نازک...... پری زاد نے اُسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ چہرے پر گہرے سیاہ شیشوں والا چشمہ لگائے اور بالوں میں گلابی ربن باندھے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ تقریب کے اختتام پر جب خود پری زاد کی نظریں اُسے بھیڑ میں تلاش کر رہی تھیں وہ اچانک اپنے آپ ہی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ''پری زاد سر...... پلیز آٹوگراف دے دیں......'' پری زاد نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ نہ جانے کیا لکھ کر کاپی گل رخ کی طرف بڑھا دی۔ وہ اپنی دھن میں مگن کہتی رہی۔ ''میں آپ کی شاعری کی بہت بڑی مداح ہوں...... لیکن آپ سے شکوہ یہ ہے کہ آپ بہت کم اپنی تخلیق کو عام قاری کی پہنچ تک رسائی دیتے ہیں۔ شاید آپ کو اپنے مداحوں کے ذوق پر اعتبار نہیں رہا......'' آس پاس کھڑے دوسرے سب لوگ ہنس دیئے۔ گل رخ نہ جانے اور کیا کچھ کہتی رہی مگر پری زاد تو اس کے ملیح چہرے اور گلابی ہونٹوں کے خم میں ہی کھویا رہا۔ گل رخ نے پری زاد سے اس کا ذاتی فون نمبر بھی مانگ لیا اور پھر

پری زاد کو زیادہ انتظار کی اذیت سے بھی نہیں گزرنا پڑا اور اگلی شام ہی گل رخ کی کال آ گئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ پری زاد کو کسی چہرے پر مطلب اور مفاد پرستی کا غمازہ دکھائی نہ دیا۔ وہ معصوم سی لڑکی پری زاد کے ساتھ دنیا جہاں کی باتیں کرنے لگی۔ اُن کے فون کا دورانیہ بڑھنے لگا۔ پری زاد اپنے اندر کے زخم یوں رفتہ رفتہ بھرتے دیکھ کر خود ہی خوفزدہ ہو گیا۔ آخر گل رخ جیسی ماہ رو کو پری زاد جیسے بدہیت شخص میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ اپنا اتنا قیمتی وقت اس پر لٹاتی رہتی تھی۔ حالانکہ اس پہلی ملاقات کے بعد گل رخ کبھی دوبارہ اس سے ملنے آمنے سامنے نہیں آئی تھی مگر دن میں دو تین بار اُس کا فون ضرور آ جاتا تھا۔ پری زاد کے اندر کا مشکوک شاعر اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا کہ صرف اس کے کلام کا اثر بھی یہ معجزہ دکھا سکتا ہے۔

اس لیے جب بھی گل رخ کا فون آتا وہ لاشعوری طور پر اس بات کا انتظار کرتا رہتا کہ کب گل رخ اُس سے کسی مالی معاونت یا کسی دنیاوی فائدے کا تقاضہ کرتی ہے۔ لیکن پری زاد کے کان گل رخ کی جانب سے ایسے کسی مطالبے کا انتظار ہی کرتے رہے اور دن گزرتے چلے گئے۔ گل رخ نے پری زاد کو بتایا تھا کہ وہ شوقیہ طور پر ایک نجی فلاحی ادارے کے لیے مجسمہ سازی کرتی ہے اور ان مجسموں سے حاصل ہونے والی رقم بچوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کی جاتی ہے۔ ایک روز گل رخ نے پری زاد کو اپنے ادارے کے دورے کی دعوت دے دی۔ وہ پری زاد کو اپنے بنائے ہوئے مجسمے دکھانا چاہتی تھی۔ پری زاد گل رخ کا فن دیکھ کر واقعی دنگ رہ گیا۔ وہ مجسموں میں جان ڈالنے کا ہنر جانتی تھی لیکن پری زاد اُس کی دوسری فرمائش سن کر لرز گیا۔ وہ پری زاد کا مجسمہ بنانا چاہتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو پری زاد کو یوں لگا کہ جیسے گل رخ بھی باقی تمام دنیا کی طرح صرف اس کا مذاق اڑانا چاہتی ہے لیکن اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت دیکھ کر پری زاد مخمصے میں پڑ گیا۔ یہ اس کی گل رخ کے ساتھ دوسری روبرو ملاقات تھی اور آج وہ پہلی ملاقات سے بھی زیادہ کھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ مگر سیاہ چشمے نے آج بھی اس کی آنکھیں ڈھانپ رکھی تھیں۔ پری زاد نے آس پاس کسی کو اپنی جانب متوجہ نہ پا کر سکون کی ایک گہری سانس لی اور دھیرے سے گل رخ کو دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا کہ ”مجسمے تو خوبصورت چہروں اور شخصیات کے بنائے جاتے ہیں۔ گل رخ اس کے کریہہ چہرے کے لیے اپنی خوبصورت اور نازک انگلیوں کو کیوں زحمت دینا چاہتی ہے؟ ...... یا پھر اُسے بھی اور لوگوں کی طرح پری زاد کی بدصورتی کا تمسخر اُڑانے کا کوئی موقع چاہیے ......؟“ گل رخ پری زاد کی بات سن کر چند لمحوں کے لیے سن ہو گئی۔ پھر کچھ دیر کے بعد جب وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں آپ کا مذاق اُڑانے کی گستاخی کر سکتی ہوں۔ ...... آپ وہ ہیں جن کے خیالات کی گہرائی اور لفظوں کے چناؤ کی خوبصورتی نے میرے اندر کی بے بس روح کو کئی بار نکھارا ہے...... مجھے جلا بخشی ہے......اور میں تو اپنی انگلیوں کی پوروں سے دنیا دیکھتی ہوں...... میرے پاس عام دنیا والی بینائی نہیں ہے...... میں پیدائشی اندھی ہوں......“ گل رخ نے آنکھوں سے

چشمہ اتار دیا اور وہاں دو گہری نیلی جھیلوں کے بے نور کٹورے دیکھ کر پری زاد کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اُس کے اندر کچھ ایسی ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ بہت کچھ کرچی کرچی ہوگیا۔ تو یہ وہ وجہ تھی کہ جس نے گل رخ کے ہونٹوں پر پری زاد کے لیے وہ تمسخر بھری مسکراہٹ نہیں آنے دی جس کا پری زاد اب تک عادی ہو چکا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہنسے یا روئے۔ گل رخ نے دوبارہ اس سے وہی درخواست کی کہ وہ اس کا مجسمہ بنانا چاہتی ہے۔ اس بار پری زاد انکار نہیں کر سکا۔ گل رخ نے پری زاد کو اپنے سامنے اسٹول پر بیٹھا لیا اور اپنی انگلیوں کی پوروں سے پری زاد کا چہرہ ٹٹول کر اس کا مجسمہ بنانا شروع کر دیا۔ پری زاد خاموش بیٹھا رہا اور جب گل رخ نے اس کا مجسمہ مکمل کیا تو پری زاد اُسے دیکھ کر رو پڑا۔ اتنا بے داغ چہرہ اور اتنے خوبصورت نقش تو اس کے کبھی نہیں تھے۔ وہ چار دن سے لگاتار تین گھنٹوں کے لیے روزانہ گل رخ کے ادارے میں اپنے چہرے کا مجسمہ بنوانے کے لیے آ رہا تھا اور آج پانچویں دن جب گل رخ نے جھجکتے ہوئے اُسے اپنا کام دکھایا تو پری زاد کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ گل رخ نے پری زاد کو روتے پایا تو وہ گھبرا گئی۔ ''کیا میں نے بہت برا مجسمہ بنایا ہے آپ کا......؟'' ''نہیں تم نے میرے اندر کے پری زاد کو مجسمے میں ڈھال دیا ہے......لیکن میں اتنا خوبصورت نہیں ہوں پیاری لڑکی......میں تو بہت مکروہ......'' گل رخ نے جلدی سے پری زاد کے ہونٹوں پر اپنا کومل ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں......آپ پھر کبھی ایسا نہیں سوچیں گے......کیونکہ جیسا میں آپ کو اپنے من کی آنکھ سے دیکھتی ہوں......میں نے آپ کو ویسا ہی بنایا ہے......'' پری زاد لاجواب ہو گیا اور اس کی زندگی میں گل رخ نام کی وہ بہار آ گئی جس کا انتظار کرتے کرتے اُسکی ساری عمر خزاں ہو چلی تھی۔ وہ دونوں روز ملنے لگے اور گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی ہمیشہ اگلے روز کے لیے کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا...... پری زاد کے اندر کی جھجک بھی ختم ہونے لگی تھی کیونکہ گل رخ سے گھنٹوں بات کرتے ہوئے ایک پل کے لیے بھی اُسے وہ مخصوص بے چینی نہیں ہوتی تھی جو عام حالات میں کسی نازنین کو اپنے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے پری زاد محسوس کرتا تھا۔ گل رخ کی بے نور آنکھیں اُسے ٹٹول کر پریشان نہیں کرتی تھیں اور جب گل رخ اس سے شعر سننے کی فرمائش کرتی اور پھر پری زاد کے لفظوں کی جادوگری میں کھو جاتی تو شاعر کو کوئی بناوٹ نظر نہیں آتی تھی اور پری زاد گل رخ کی اس سچی اور پر خلوص داد پر نہال ہو جاتا تھا۔ پری زاد نے چند دن کے اندر ہی اپنا اندر گل رخ کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ ایک روز وہ گل رخ کو اپنے گھر کے اس گوشے میں بھی لے گیا جو اس نے آج تک باقی دنیا سے چھپا رکھا تھا۔ یہ وہ ہال تھا جہاں پری زاد نے اپنے اندر کے موسیقار کو زندہ رکھا ہوا تھا۔ اس روز پری زاد نے گل رخ کو پیانو پر بہت سی دھنیں سنائیں۔ وہ انمول ساز جو آج تک پری زاد کے من کے تار جھنجھناتے رہے تھے وہ سارے اس نے گل رخ کی سماعتوں کی نذر کر دیئے لیکن وہ گل رخ کو آج بھی یہ نہ بتا پایا کہ وہ اس کی محبت میں غرق ہو چکا ہے اور گل رخ جس جذبے کو صرف پری زاد کی دوستی کے عنوان سے جانتی ہے، وہ اصل

میں ایک جان لیوا عشق کا روپ دھار چکا ہے......

پر زمانے کا عشق کہاں راس آتا ہے۔ دنیا کو سدا محبت سے بیر رہا ہے۔ لوگ ہمیشہ پیار کے دشمن ہوتے ہیں اور اگر کوئی محبت زمانے کے وار سے چوک جائے تو مقدر اپنی تلوار لیے اُس عشق کی جان قبض کرنے کے لیے پہنچ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی ماجرا پری زاد کے عشق کے ساتھ بھی ہوا۔ جس روز وہ اپنے دل میں یہ پختہ عزم لیے گل رخ کے پاس پہنچا کہ آج وہ اپنے دل کا حال اُسے بتا کر ہی رہے گا، اسی دن گل رخ نے خود اسے یہ خبر سنا کر پری زاد کے دل پر بجلی گرا دی کہ اسے آج ہی آنکھوں کے بڑے ہسپتال سے ڈاکٹر شرجیل نے فون کر کے بتایا ہے کہ جلد ہی گل رخ کو آنکھیں ملنے والی ہیں۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ پری زاد کے سامنے ڈاکٹر شرجیل کا ذکر کر چکی تھی کہ وہ ڈاکٹر بڑی تندہی سے گل رخ کی آنکھوں سے میل کھاتے قرینے کی تلاش میں جتا ہوا ہے مگر اس سے پہلے پری زاد نے کبھی شرجیل نامی اس ڈاکٹر کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ لیکن جب اس روز وہ پری زاد کی موجودگی میں گل رخ سے ملنے آیا تو پری زاد کی نس نس میں جیسے شرارے سے بھر گئے۔ شرجیل ایک خوش لباس دراز قامت اور خوبرو نوجوان تھا۔ وہ جتنی دیر بھی گل رخ کے پاس بیٹھا ہنس ہنس کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پری زاد کے رگ و روپ میں آگ سی بھڑکتی رہی۔ وہ زندگی میں آج تک جس جذبے سے ناواقف تھا ''رقابت'' کا وہ جذبہ پوری شدت سے پری زاد پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ ستم بالائے ستم شرجیل نے پری زاد کے سامنے ہی جب آپریشن کی بیش قیمتی کا ذکر بھی کر دیا تو بادل نخواستہ اُسے گل رخ کے سامنے ڈاکٹر کو یہ پیش کش بھی کرنی پڑی کہ لاکھوں کے اس آپریشن کا تمام خرچہ بھی پری زاد خود ہی اٹھانے کو تیار ہے۔ شرجیل نے خوش ہو کر چٹکی بجائی کہ پھر تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے گا کیونکہ گل رخ کے آپریشن میں دیر صرف رقم کی کمی کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ پری زاد کے بس میں ہوتا تو وہ گل رخ کی آنکھوں کا یہ علاج عمر بھر نہ ہونے دیتا کیونکہ اس کے دل میں یہ خوف بری طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ گل رخ بینائی واپس ملتے ہی جب اس پر پہلی نظر ڈالے گی، اسی وقت وہ اسے مسترد کر دے گی۔ خاص طور پر اب اس ڈاکٹر کی جاذب نظر شخصیت کے سامنے تو وہ اور بھی خود کو بدہیت محسوس کرنے لگا تھا۔ پری زاد ٹوٹے قدموں سے گھر واپس آ گیا اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے دل میں کسی کو قتل کرنے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔ رقیب کو قتل کرنے کے علاوہ ایک عاشق کے پاس دوسرا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہوتا۔ اس رات پری زاد نے کئی سال بعد ایک بار پھر سجدے میں گر کر اپنے خدا کے سامنے فریاد کی کہ یا تو وہ اس کے اندر کے پری زاد کو مار ڈالے ..... یا پھر اس ڈاکٹر کا خاتمہ ہو جائے..... کیونکہ اب وہ اپنی اس جہد مسلسل سے تھک کر چور ہو چکا ہے۔ پری زاد کو اپنی اس حد درجہ خود غرضی پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ صرف اپنے مقصد کے حصول کے لیے رقیب کو موت کے گھاٹ اتارنے کے منصوبے بھی بنا رہا ہے۔ پری زاد جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا جاتا اور آخر کار اس شدید کشمکش نے اسے بستر پر لا پھینکا۔ شدید بخار سے اس کا

جسم تپتے گئے اور وہ [illegible] تین دن تک گل رخ سے ملنے کے لیے نہیں جا سکا تو گھبرا کر وہ خود پری زاد سے ملنے چلی آئی لیکن پری زاد نے دل پر بھاری پتھر رکھ کر نوکر کو گل رخ سے جھوٹ بولنے کا کہہ دیا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ پری زاد نے دل میں ایک فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ وہ گل رخ کی آنکھوں کے آپریشن کی رقم ڈاکٹر شرجیل کے پاس جمع کروا کر خود ہمیشہ کے لیے یہ شہر چھوڑ دے گا۔ کیونکہ وہ کم از کم گل رخ کی آنکھوں میں اپنے لیے وہ حقارت و نفرت برداشت نہیں کر سکتا تھا جو آج تک ساری زندگی باقی دنیا والوں کی نگاہوں میں دیکھتا آیا تھا۔

اور پھر اُس نے یہی کیا۔ ایک خط میں اپنے منیجر کو تمام ضروری ہدایات اور ڈاکٹر شرجیل کے نام ایک بڑی رقم کا چیک چھوڑ کر پری زاد نے بنا کسی کو بتائے جنگلوں، صحراؤں اور ویرانوں کا رخ کر لیا۔ اسکی عمر بھر کی ریاضت رائیگاں چلی گئی تھی اس نے عمر بھر میں چاہا ہی کیا تھا؟ صرف ایک محبوب کا درجہ......اور وہ اعزاز بھی کبھی اُس کا مقدر نہ بن سکا۔ لہٰذا اب پری زاد کے لیے یہ دولت، یہ شہرت، یہ جائیداد اور یہ کاروبار کے قصے سب بے فائدہ تھے۔ اس کا دل ان سب چیزوں سے اُچاٹ ہو گیا تھا اور اس نے اپنے آپ سے عہد کر لیا تھا کہ اب وہ زندگی بھر اپنے نادان دل کے بہکاوے میں آ کر کسی خوبصورت چہرے، کسی نرم لمس کے جال میں نہیں پھنسے گا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن تو اس کا اپنا دل ہی تھا۔ لیکن اب پری زاد کو اپنے دشمن کی خوب پہچان ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس نے تمام ممکن احتیاطی تدابیر بھی [illegible] تھیں۔ اس نے کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا ہی ترک کر دیا۔

ویرانوں میں بھٹکتے بھٹکتے اس کا حلیہ بھی کسی جوگ لیے جوگی کی طرح ہوتا گیا۔ پھٹے پرانے کپڑے، بے ترتیب بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھیں۔ چہرے پر زمانے بھر کی گرد اور شانوں تک لٹوں کی طرح جھولتے ہوئے لمبے گیسو۔ پری زاد [illegible] عقیدت سے اس کے سامنے دوزانو ہو جاتے۔ وہ اُسے کوئی پہنچا ہوا پیر بزرگ [illegible] اپنی [illegible] ضروریات کے لیے بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا تھا۔ جسے [illegible] کے جواب میں صرف ایک ہاں یا ناں کرتا تھا۔ یہ ظاہر پرست دنیا [illegible] کا فیصلہ کرتی آئی ہے۔ سو پری زاد پر بھی اس جہاں کا اعتماد بڑھتا [illegible] مخلوق کو دھتکارے جانے کے عمل کو بھی اس کی بزرگی کی نشانی سمجھ لیا گیا۔ [illegible] پری زاد کی زبان سے نکلی بے معنی باتوں کو خود ہی کوئی نہ کوئی اور اپنے مطلب کے معنی پہنا کر اپنی منتوں کی قبولیت کی وجہ سمجھ لیتے اور پری زاد کے قدموں میں نذر و نیاز کے ڈھیر لگاتے جاتے جنہیں وہ اپنی ٹھوکر سے دور پھینک دیتا تھا۔ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سال بنتے چلے گئے۔ پری زاد کا سفر نہ ختم ہونے والا تھا۔ لیکن پھر اس سفر کا ایک ایسا پڑاؤ آیا جب ہفتوں کے فاقے اور موسم کی سختی رنگ لائی اور پری زاد بیمار ہو کر کسی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پڑ گیا۔ حسب معمول لوگوں نے اس کے حلیے کی وجہ سے اُسے تکریم سے اٹھا کر پلیٹ فارم پر لگے گھنے پیپل کے پیڑ کی چھاؤں میں لا کر ڈال دیا اور قلیوں نے دیگر عملے کی مدد سے

ایک تکیے اور بستر کا [illegible] دیکھتے دیکھتے وہیں ریلوے اسٹیشن پر ایک آستانہ بن گیا اور آتے جاتے مسافر پری زاد کے پاؤں چھو کر اور اگر بتیاں جلا کر آگے بڑھنے لگے۔ پری زاد وہیں پڑا رہتا۔ بیماری اور نقاہت نے اس کے قدم جکڑ رکھے تھے ورنہ وہ اس ہنگامے کے درمیان ایک دن بھی مزید نہ گزارتا۔ وہ ایک ایسی ہی لو برساتی شدید گرم دوپہر تھی جب پرندوں نے بھی اپنی پرواز کچھ دیر کے لیے موقوف کر دی تھی لیکن پری زاد کے لیے یہ گرم موسم بھی ایک نعمت تھا کیونکہ چاہے کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر لوگوں کی بھیڑ اور رش سے اُسے نجات مل گئی تھی۔ وہ آنکھیں موندھے یونہی چپ چاپ لیٹا ہوا تھا کہ اچانک ایک مانوس آواز نے اس کے روح کے تار جھنجھوڑ کر رکھ دیے ''بابا...... میرے لیے دعا کیجئے...... میں بہت بے سکون ہوں......'' پری زاد نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔ کیا خواب اگر سماعتوں کی صورت بھی اترتے ہیں؟ وہ اپنی سماعت کا یہ حسین خواب تمام عمر توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں...... وہ گل رخ ہی کی آواز تھی۔ پری زاد انجانے میں دربدر بھٹکتے دوبارہ اپنے شہر آ پہنچا تھا لیکن گل رخ اسے پہچان نہیں پائی تھی...... وہ اُسے پہچانتی بھی کیسے؟...... اُسے تو وہ بھی نہیں پہچان پاتے تھے جنہوں نے ایک عمر اس کے ساتھ گزاری تھی جبکہ گل رخ نے تو صرف اپنی سماعتوں سے اسے پہچانا اور ہاتھ کی پوروں سے دیکھا تھا۔ پری زاد نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ کر بند کر لیے۔ گل رخ کچھ دیر کی دعا کی آس میں اس کے قدموں میں بیٹھی رہی۔ پری زاد میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ دو گھڑی کے لیے اس کی جانب دیکھ سکے۔ گل رخ مایوس ہو کر اٹھی۔ ''شاید آپ کے پاس بھی میرے لیے کوئی دعا نہیں...... میں تو اوروں سے آپ کے بارے میں سن کر یہاں تک چلی آئی تھی...... آپ کی تنہائی میں مخل ہونے کی معذرت چاہتی ہوں......'' گل رخ اٹھ کر چل دی۔ پری زاد نے اپنی بھیگی پلکیں کھول کر اُسے پلٹتے ہوئے دیکھا۔ دفعتہً گل رخ کو ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچی۔ پری زاد نے گھبرا کر بے اختیاری میں گل رخ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گرنے سے روکنے کی کوشش کی اور چند لمحوں کا یہ لمس ہی قیامت ڈھا گیا۔ گل رخ پری زاد کا ہاتھ چھوتے ہی سن ہو کر رہ گئی اور پھر اس کی آنکھیں برس گئیں۔ بمشکل اس کی زبان سے صرف ایک نام نکل سکا ''پری زاد......'' پری زاد نے گھبرا کر اپنا ہاتھ یوں کھینچ لیا جیسے اس نے کسی انگارے کو چھو لیا ہو۔ گل رخ روتے ہوئے بولی ''آپ آج بھی میرے سامنے آنے سے خوف [illegible] آپ کو [illegible] ہے پری زاد...... میں آج بھی بینائی سے محروم ہوں......'' پری [illegible] کر دور گرے ہوئے کالے چشمے کی طرف دیکھا [illegible] گل رخ کا [illegible] ہاتھ [illegible] کیوں......؟ میں نے تو تمہارے علاج کی رقم [illegible]

کیوں......؟......''

گل رخ رو پڑی ''مجھے بصارت چاہیے تھی پری [illegible] لیکن ایسی بصارت نہیں جو [illegible]

دور کر دے.....'' جب شرجیل نے مجھے بتایا کہ آپ نے علاج کی رقم کا چیک لکھ دینے کے بعد خود کو تمام دنیا کی بصارتوں سے دور کر لیا ہے تو میں سمجھ گئی کہ آپ اپنی ظاہری شکل وصورت کی وجہ سے میری بینائی سے خوف زدہ ہیں..... میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں پری زاد کہ میری بصارت آپ کو کبھی بدصورت نہیں دکھا سکتی تھی..... عام دنیا والے پہلے کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور پھر بعد میں اُسے چھو کر پہچاننے کی صلاحیت حاصل کرتے ہیں لیکن مجھے قدرت نے پہلے میری انگلیوں کی پوروں سے دنیا کو دیکھنے کی نعمت عطا کی تھی، میری بعد میں ملنے والی بصارت میری پہلی پہچان کو کیسے مٹا پاتی.....؟..... آپ کی دنیا کے خوبصورت اور بدصورتی کے معیار میرے لیے نہیں بنائے گئے تھے۔ پری زاد..... پر آپ میری بات سنے بغیر ہی چلے گئے..... میں تو آپ سے یہ بھی نہیں کہہ پائی کہ میں آپ کے لفظوں کی میڑھی چڑھتے چڑھتے آپ کی محبت کے جزیرے میں آ پہنچی ہوں..... آپ نے حال دل سننے سے پہلے ہی مجھ سے قطع تعلق کر لیا۔ میں نے اور شرجیل نے مل کر آپ کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر آپ نہ ملے۔ تب میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اب سدا بے بینا ہی رہوں گی..... جو نظر پری زاد کو نہ نہار سکے..... اس سے میں اندھی ہی بھلی.....''

پری زاد کے دل ودماغ میں شدید تیز آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے اور اس کی آنکھیں جاڑے کی برسات کی طرح سارے کواڑ توڑ کر برس رہی تھیں۔ ''مجھے تم سے محبت ہوگئی تھی گل رخ..... شدید اور بے تحاشہ محبت..... اور میں اپنی محبت کی نظر میں اپنے لیے حقارت نہیں دیکھ سکتا تھا..... اس لیے دنیا ہی تیاگ دی.....''

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے زاروقطار رو رہے تھے۔ آس پاس گزرتے مسافر اور قلی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ ایک اندھی عورت ان کے ''سائیں'' کے قدموں میں بیٹھی رو رہی ہے اور ان کا مرشد بھی اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہے..... دور کھڑے ایک قلی نے عقیدت سے دوسرے قلی سے کہا ''لگتا ہے آج مرشد کی بدولت اس عورت کی بھی کوئی دیرینہ مراد پوری ہوگئی ہے۔''

مگر وہاں کھڑے لوگوں میں سے یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آج صرف اس عورت کی ہی نہیں..... ان کے سائیں کی واحد مراد بھی پوری ہوگئی ہے..... کسی کا محبوب بننے کی مراد..... کسی کا دلبر بننے کی آرزو..... کسی پری کا پری زاد بننے کی تمنا.....



لفظ گر (افسانہ)

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی قصبے کے مرکزی چوک میں لگے قدم سالی خوردہ گھنٹہ گھر کی لرزتی ہوئی گھنٹی نے دو مرتبہ گونج کر قصبے کی گلیوں میں اونگھتے ہوئے آوارہ کتوں کو پھر سے چونک کر بھونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ باہر تیز ہوا کا شور اور پہاڑوں کے پیچھے کوندتی آسمانی بجلی کی لمحہ بھر کی جھلک اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ موسم کے تیور کسی بھی لمحہ برسنے والے ہیں۔ لوگ اپنے گھروں کو محفوظ دیواروں کے پیچھے اپنے نرم اور گرم بستروں میں محوخواب تھے لیکن اس قدیم قصبے کی مرکزی شاہراہ سے جڑی ایک گلی میں واقع اُس بڑے ادیب کے کمرے کی کھڑکی سے اب بھی مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ کی روشنی، مٹیالے شیشوں سے چھن چھن کر باہر سے گزرنے والے اکا دکا راہ گیروں کو اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی لیکن کوئی بھی اس قیامت سے واقف نہ تھا جو اس وقت اس بڑے ادیب کے دل پر گزر رہی تھی جو اپنے وسیع کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے بے خیالی میں بار بار اپنی انگلیاں مسل رہا تھا۔ اس کی نظر بار بار کمرے کی میز پر رکھے وقت پیما پر پڑ رہی تھی۔ جس کے اوپر کے حصے سے ریت اتنی ہی تیزی سے نچلے حصے میں پھسلتی جا رہی تھی۔ جس تیزی سے اس بڑے ادیب کے ہاتھوں سے وقت......

اُسی میز پر لیمپ سے ذرا فاصلے پر وہ قلم اور دوات بھی دھرے تھے جن سے اب تک وہ بڑا ادیب نہ جانے کتنے شاہکار تصنیف کر چکا تھا تبھی تو پورے ملک میں اس کے فن تحریر کی دھوم تھی۔ وزیروں اور مشیروں کے ہاں دعوتوں میں اُسے خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔ شہر اور قصبے کے رئیس اور امراء اس کے ساتھ دوستی اور تعلق کو فخر سے بیان کرتے تھے اور اس کی رومانی داستانوں کو پڑھتے ہوئے نہ جانے کتنی پردہ نشینوں کا دل اس

کے نام پر دھڑکنا شروع کر دیتا تھا۔ پچاس کے پیٹے کو تقریباً گزار چکنے کے باوجود خواتین میں اس کی یہ مقبولیت اُسے ہمیشہ نازاں و فرحاں رکھتی تھی۔

لیکن آج کی یہ طوفانی رات اس بڑے ادیب پر بڑی بھاری تھی۔ حتیٰ کہ ان نازنینوں کے ہفتہ بھر کے جمع کیے ہوئے درجنوں خطوط بھی اس کی توجہ نہیں بٹا پا رہے تھے جو سامنے میز پر وقت پیا کے قریب ہی ایک مہکتے ہوئے انبار کی صورت میں جمع پڑے تھے۔ دفعتہً ادیب کی نظر ان مہکتے ہوئے محبت ناموں سے پھسل کر اُس مسودے پر جا پڑتی ہے جو نہ صرف آج کی رات بلکہ جانے پچھلی کتنی راتوں سے اس کی نیند اُڑانے کا باعث بنا ہوا تھا۔ بڑا ادیب ایک دم یوں چونکتا ہے جیسے میز پر عام سے کاغذ پر لکھا کوئی مسودہ نہیں بلکہ کوئی کالا ناگ پھن پھیلائے بیٹھا ہو۔

ابھی چند دن پہلے ہی کی تو بات ہے۔ اُس بڑے ادیب کی زندگی میں سکون اور چین کی روانی تھی۔ فخر اور غرور کا غلبہ تھا۔ عام لوگوں میں ایک منفرد اور سب سے ممتاز حیثیت حاصل ہونے کا اطمینان تھا۔ قصبے کے واحد اور بڑے، چوبی فرش والے ہال میں جب کسی تقریب میں بطور مہمان خصوصی اُسے بلایا جاتا اور مقرر اس کے فن کے حوالے سے اپنی تقاریر میں اس کی تعریف میں زمین و آسماں کے قلابے ملاتے تو وہ کس قدر فخر کے ساتھ ہال میں بیٹھے سامعین کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھا کرتا تھا۔ کس طرح خاص بالکونیوں میں بیٹھی اُمراء کی شریف زادیوں کی آنکھوں میں ستائشی پیغامات کو بظاہر لاپرواہی سے ٹال جایا کرتا تھا اور پھر ایک دن اسی ہال کے مرکز سے پچھلی نشستوں سے ایک نوجوان اُٹھ کر اسٹیج پر آیا تھا۔ ہاں، وہی ایک معمولی سا نوجوان، جو شہر کے ایک عام مزدور کا بیٹا تھا لیکن خوش قسمتی سے ایک دوسرے بڑے قصبے سے حکومت کے خرچ پر تعلیم حاصل کر کے واپس لوٹا تھا۔ اس نوجوان نے اسٹیج پر آ کر بڑے ادیب کے تازہ ترین فن پارے پر نہایت موثر اور مدلل تجزیہ پیش کیا اور اعتراف کیا کہ وہ بچپن ہی سے بڑے ادیب کے فن کا بہت بڑا قدر دان اور مداح رہا ہے اور اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہے کہ آج قدرت نے اُسے یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے آئیڈیل کی مدح سرائی میں اسٹیج پر کھڑا ہے۔

بڑے ادیب کا اس نوجوان سے یہ پہلا تعارف تھا لیکن کون جانتا تھا کہ آئندہ چند مہینوں میں یہ تعارف ادیب کے لیے ایک چبھتے کانٹے کی صورت اختیار کر لے گا۔ نوجوان نے اُسی دن اسٹیج پر ادب کی دنیا میں اپنا پہلا قدم رکھنے کا عزم قصبے پر ظاہر کر دیا تھا اور بڑے ادیب سے رہنمائی حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ جواباً بڑے ادیب نے اپنی اختتامی تقریر میں اس نوجوان کے ادبی مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور اپنی سرپرستی اور رہنمائی کے ہر لمحہ میسر ہونے کی یقین دہانی بھی کروائی تھی۔ اس کے بعد قصبے کے واحد بڑے اخبار میں اس نوجوان کے اکا دکا مضامین اور افسانے چھپنے لگے جنہیں پڑھنے کا موقع

کبھی اس بڑے ادیب کو ملا ہی نہیں کیونکہ وہ اکثر تقاریب کے سلسلے میں قصبے سے باہر ہی رہتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ بڑے ادیب کو اس حقیقت کا ادراک ہونے لگا کہ قصبے کے لوگ اس نوجوان کی تحریر میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ خاص طور پر نوجوان طبقہ اس کی تحریروں سے کافی متاثر نظر آتا تھا کیونکہ شاید اس کی تحریر قصبے کے نوجوانوں کو اپنے دل کے قریب محسوس ہوتی تھی۔ بڑے ادیب کو [illegible] پھر ایک دن بڑے ادیب کو اُس وقت چونکنا پڑا جب ایک تقریب [illegible] میں [illegible] بڑے ادیب کے ساتھ مہمانانِ خصوصی کی فہرست میں شامل کر دیا گیا تھا۔ تقریب کے منتظمین نے اس بات کی وضاحت تقریب کے دعوت نامے میں ہی کر دی تھی کہ تقریب کے مہمانِ خصوصی تو حضرت بڑے ادیب ہی ہوں گے اور دیگر شرکاء میں سے وہ نوجوان ادیب صرف نوجوان طبقے کی نمائندگی کے لیے اسٹیج پر موجود رہے گا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ بڑے ادیب کو اپنے اقتدار میں کسی دوسرے کی اتنی سی شرکت بھی گوارا نہیں تھی۔ بڑا ادیب اندر سے بہت جز بز ہوا لیکن اپنی اندرونی کشمکش کو تقریب کے دوران اپنے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیا۔ تقریب کے اختتام پر نوجوان ادیب نے اپنے نئے افسانے کا مسودہ بھی بڑے ادیب کی خدمت میں پیش کر دیا تاکہ بڑا ادیب اس کا تنقیدی جائزہ لیکر اپنی رائے سے مطلع کر سکے۔ بڑے ادیب نے محسوس کر لیا تھا کہ لوگ اب نوجوان کی تحریر کو سنجیدگی سے لینے لگے ہیں، لہٰذا اس نے وہیں کھڑے کھڑے اس نوجوان کے مسودے سے چند صفحے پلٹے اور بے دلی سے نظر ڈالنے کے بعد وہیں اپنے مداحوں کی بھیڑ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے استہزائیہ انداز میں ایک قہقہہ لگایا اور نوجوان کی تحریر میں بلاوجہ چند کیڑے نکالے اور اُسے مزید محنت کی تلقین کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اگر وہ نوجوان ادیب اُس بڑے ادیب کے مشوروں پر عمل کرے گا تو ہو سکتا ہے کہ بڑا ادیب اُسے اپنے اخبار میں چھپنے کے لیے بھی زیرِ غور رکھے۔ نوجوان مصنف نے خندہ پیشانی سے بڑے ادیب کی تمام تنقید [illegible] خواست [illegible] نصیبی ہوگی کہ اگر بڑا [illegible] مصنف کو اس کی تحریر کی خامیوں سے آگاہ [illegible] پڑا اور بہت دن تک تو اس نے نظر انداز کر [illegible] البتہ جب بھی درمیان میں نوجوان مصنف سے اس کا آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ بھری محفل میں نوجوان ادیب کی تحریر پر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دو چار فقرے ضرور کس دیتا تھا لیکن نوجوان ادیب نے ہمیشہ اسکی تنقید اور طنز کو سعادت مندی کے ساتھ ہی قبول کیا۔

اس دوران بڑے ادیب نے اس بات کا خاص اہتمام رکھا کہ نوجوان ادیب کی تحریریں اس کے زیرِ صدارت چلنے والے اخبار میں نہ چھپ سکیں پھر ایک دن اچانک، جب موسم کے تیور اس رات کی طرح ہی بھیانک تھے بڑے ادیب کو سرِ شام ہی کسی تقریب کے ملتوی ہو جانے کی وجہ سے قصبے کو لوٹنا پڑا۔ اس کی شاندار

تبھی جب قصبے کے مرکزی ہال کے سامنے سے گزر رہی تھی تو اس نے وہاں پر جوش نوجوانوں کا ہجوم دیکھا جو دیوار پر لگے کسی اشتہار کے سامنے جمع تھا۔ بڑے ادیب کی بگھی کو آتا دیکھ کر لوگ جلدی سے اس کی جانب مڑے، مجبوراً ادیب کو کوچوان کو رُکنے کا کہنا پڑا۔ باہر ڈھلتی شام اور تیز بوندا باندی نے ہوا میں شدید خنکی بھر دی تھی لیکن خلاف دستور قصبے کے لوگ ابھی تک ہال کے سامنے جمع تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی خبر نے ان کے اندر ایسا جوش بھر دیا تھا جس سے انہیں اس شدید سردی کا احساس بھی نہ رہا ہو۔ لوگوں کا ہجوم کالی چھتریوں کے آسمان تلے مکھیوں کے کسی چھتے کی مانند اُس اشتہار سے چپکا ہوا تھا جو بڑے ہال کے چوبی دروازے پر چسپاں تھا۔ آخر کار عقدہ یہ کھلا کہ قصبے کے نوجوان مصنف کے کسی افسانے کو مرکزی حکومت نے اس فہرست میں شامل کر دیا ہے جنہیں ہر سال کے آخر میں تمغے کے لیے ایک جیوری کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ پھر جیوری کڑی جانچ اور فنی معیار کی تمام تر باریکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان میں سے کسی بھی ایک فن پارے کو اس سونے کے تمغے کے لیے چنتی تھی جو ہر سال کے آخر میں ایک بہت بڑی اور پر وقار تقریب میں خود سربراہ مملکت کے ہاتھوں اس فن پارے کے تخلیق کار کے گلے میں پہنایا جاتا تھا۔

یہ خبر سنتے ہی جانے کیوں بڑے ادیب کو اپنے جسم کا سارا خون اپنی کن پٹیوں کی جانب دوڑتا محسوس ہونے لگا۔ ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ اس سال کی جیوری میں خود اس بڑے ادیب کا نام بھی ملک کے دیگر ادیبوں کے ساتھ شامل تھا۔ اُسے ایسا لگا جیسے پل بھر میں اس کی برسوں کی ریاضت سے بنائی اور کمائی ہوئی سلطنت کا ایک اور حصہ دار پیدا ہو گیا ہو۔ بڑے ادیب کو یہ سوچ کر ہی ہول آنے لگا کہ اب قصبے میں کوئی ادبی حوالہ دیا جائے گا تو اس کے نام کے ساتھ اس نوجوان ادیب کا نام بھی آئے گا۔ جب کبھی کسی تقریب میں اسے مدعو کیا جائے گا تب اس کی کرسی کے ساتھ ساتھ اس نوجوان ادیب کی کرسی بھی اس کے شانہ بشانہ لگائی جائے گی اور اگر خدانخواستہ وہ نوجوان خوش قسمتی سے اس تمغے کا حق دار بھی سمجھا گیا تو سمجھو بڑے ادیب کی تو پوری ریاست ہی لوٹ لی جائے گی۔ قصبے کے لوگ اسے کوئی متروکہ شخصیت سمجھ کر رفتہ رفتہ بھول جائیں گے۔ لوگوں کی نظر سے اس کے لیے داد و تحسین اور رشک کی چمک رفتہ رفتہ معدوم ہو جائے گی۔ محفلوں میں نازنینوں کے جھرمٹ اُسے دیکھ کر اُس کی جانب لپکنے کے بجائے اس کے آتے ہی کسی اور جانب چھٹ جائیں گے۔ اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد آئندہ بڑے ادیب کو ایسی تقریبات میں مدعو ہی نہ کیا جائے؟؟؟ یہ سب سوچتے ہی بڑے ادیب کو ایک جھرجھری سی آ گئی اور اسے اپنا بدن شدید بخار سے تپتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

بڑے ادیب کی انا پر دوسری کاری ضرب اس وقت لگی جب اُسے یہ پتہ چلا کہ منتخب ہونے والا افسانہ نوجوان ادیب کی وہی کاوش ہے جو مہینوں پہلے اس نے بڑے ادیب کو فنی تجزیے کے لیے دی تھی اور جس کا بڑا ادیب اب تک ہر محفل میں جانے کتنی بار مذاق اڑا چکا تھا۔ اب یہ سوچ کر ہی اسے ''سرسام'' طاری

ہونے لگتا تھا کہ اگر جیوری نے اپنا فیصلہ اسی افسانے کے حق میں دے دیا تو اُس کی علمی اور فنی قابلیت قصبے کے لوگوں کی نظر میں کیا رہ جائے گی؟؟

جس افسانے کو پڑھے بغیر وہ آج تک شدید تنقید کرتا رہا تھا اُس دن جب پہلی مرتبہ اس نے اس کے ورق پلٹے تو بڑے ادیب کو محسوس ہوا کہ صفحے اس کا منہ چڑا رہے ہیں۔ ہر لفظ میں پختگی، ہر جملے میں اتنا گہرا پن...... سچ ہے کہ وہ افسانہ تو تھا ہی ایک ایسا شاہکار جسے کسی اعزاز ہی کا مستحق ہونا چاہیے تھا۔ بڑے ادیب کے اندر کا لفظ گر اور فن کار چیخ چیخ کر اس افسانے کی ہر سطح پر داد دیتا رہا اور افسانہ ختم کرتے کرتے بڑا ادیب اس بری طرح سے ہانپنے لگا تھا جیسے وہ جانے کتنے میل کی دوری سے دوڑتا ہوا کسی بلند چوٹی تک پہنچا ہو۔

باہر کسی بگھی کے گزرنے اور گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز گونجتی ہے۔ بڑا ادیب کے خیالات کی رو ٹوٹ جاتی ہے اور وہ چونک کر میز پر پڑی اپنی جیبی گھڑی کو دیکھتا ہے۔ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا ہے اور صبح اُسے ہر حال میں اپنا فیصلہ جیوری کے باقی ارکان کو منتقل کرنا ہی ہوگا۔ کیونکہ اب مزید ٹال مٹول ممکن نہیں تھا اور کل تو فیصلے کا دن بھی تھا۔ اب تک کے نتائج سے یہ صاف ظاہر تھا کہ آخر کار بڑے ادیب کا ووٹ ہی فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ یعنی اگر وہ نوجوان ادیب کے حق میں فیصلہ دے گا تو تمغہ اس کا نصیب ہوگا اور اس کا فیصلہ اگر خلاف ہوا تو نوجوان ادیب ہمیشہ کے لیے اس اعزاز سے محروم ہو جائے گا۔ یہی وہ کش مکش تھی جس نے کئی ہفتوں سے بڑے ادیب کو ہلکان کر رکھا تھا۔ اسکے اندر کا حاسد خود پرست، خود غرض اور خود پسند آدمی اُسے نوجوان مصنف کے حق میں فیصلہ دینے سے روکتا تھا اور چیخ چیخ کر اُسے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے انجام سے باخبر کرتا تھا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر نہ کھودے ورنہ کل اس قصبے میں کوئی اس کا نام لیوا بھی نہ ہوگا اور یہ تمام عزت، شہرت اور توقیر کسی اور کے نام ہو جائے گی۔ لیکن بڑے ادیب کے اندر کا سچا فنکار اسے اس بے ایمانی کے گناہ سے روکتا اور تنہائی میں اُسے نشتر چبھوتا تھا کہ کیا وہ اندر سے اتنا ہی بودا اور کمزور ہے کہ ایک نئے آنے والے کے لیے جگہ خالی کرنے سے بھی خوفزدہ ہے؟؟ ایسا تنگ نظر، کم ظرف تو وہ پہلے کبھی نہ تھا، کبھی کبھی تو اس کے اندر کے چھوٹے انسان اور ایک سچے فن کار کے اندر کی یہ جنگ اس قدر بڑھ جاتی تھی کہ اسے اپنی روح دو حصوں میں کٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اسے یوں لگنے لگتا تھا کہ ضمیر کی آری اس کے اندر کے حقیقی لفظ گر اور اس کم ظرف انسان کو الگ کرنے کی تگ و دو میں اسے چیر پھاڑ کر علیحدہ کر رہی ہو۔ ظرف اور کم ظرفی کی اس کھینچا تانی میں اسے اپنی روح کے ریشے تک ادھڑتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور آج تو فیصلے کی رات اس قدر بھاری تھی کہ لمحے بھی صدیوں کی طرح سرک رہے تھے۔

اور پھر آخر کار ہر رات کی طرح اس رات کا انجام بھی ایک صبح ہی تھی۔ چاہے وہ صبح دوسری عام صبحوں کی طرح چمکیلی اور روشن نہ تھی لیکن پھر بھی رات کے اندھیرے کو ٹالنے کے لیے کافی تھی۔ رات کے آخری پہر

بادل دل کھول کر برسے تھے اور اب قصبے کی مرکزی سڑک کسی تالاب کا منظر پیش کر رہی تھی۔ آس پاس کے گھروں سے شریر بچے نکل کر اپنا پسندیدہ مشغلہ یعنی ''کاغذ کی کشتی اور بارش کا پانی'' میں مشغول ہو چکے تھے۔ آسمان اب بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور گھروں کی چمنیوں سے کالے دھوئیں کے ساتھ چائے اور کافی کی مہک بھی فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں لوگ ٹھٹھرتی ہوا کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے اپنے لمبے لمبے اوورکوٹ پہنے رفتہ رفتہ بڑے ادیب کے گھر کے باہر جمع ہونے لگ گئے کہ آج ان کے قصبے کے ہر دلعزیز نوجوان مصنف کی قسمت کا فیصلہ بڑے ادیب کے قلم سے طے جو ہونا تھا۔ لیکن اب رفتہ رفتہ اس ہجوم میں بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی کیونکہ دن چڑھنے کے باوجود خلاف معمول بڑا ادیب ابھی تک اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ قصبے کے لوگ تو آج اس ارادے سے اکٹھے ہوئے تھے کہ بڑے ادیب کو ایک جلوس کی صورت میں مرکزی ہال تک لے کر جائیں گے جہاں اسے اپنے اہم فیصلے کا اعلان کرنا تھا لیکن آخر اس تاخیر کی وجہ کیا تھی؟ لوگوں کی بے چینی اب اپنے عروج پر آ پہنچی تھی لہٰذا چند بڑے بوڑھوں نے خود آگے بڑھ کر بڑے ادیب کے گھر کا بڑا سا چوبی دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا لیکن کوئی جواب ندارد...... اب تو مجمعے میں تشویش بھری سرگوشیاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ آخر کار گھنٹہ بھر کے انتظار اور طویل بحث کے بعد یہ طے پایا کہ پائیں باغ کے راستے سے کوئی ایک نوجوان اندر کود کر گھر کی پچھلی جانب سے اندر داخل ہو کر دروازہ کھولے گا۔

دروازہ کھلتے ہی ہجوم میں دھکم پیل شروع ہوگئی لیکن تین چار بزرگوں نے آگے بڑھ کر سب کو ڈانٹا اور وہیں ٹکے رہنے کا حکم دے کر خود محتاط قدموں سے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ بڑے ادیب کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا اور دور سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے افسانہ پڑھتے پڑھتے وہ تھک کر وہیں میز پر سر رکھے سو گیا ہے لیکن قریب جانے پر خون کی وہ پتلی سی دھار صاف دیکھی جا سکتی تھی جو بڑے ادیب کی کن پٹی سے ہوتی ہوئی میز سے نیچے ڈھلک کر ایک چھوٹے سے سرخ تالاب کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ قریب ہی میز پر لکڑی کے دستے والا وہ لمبا سا ریوالور بھی پڑا تھا جو عام حالات میں ادیب کے کمرے کی انگیٹھی والے کارنس پر سجا رہتا تھا۔ سب سے پہلے داخل ہونے والے بوڑھے نے میز پر پڑی ہوئی فیصلے کی وہ فہرست اٹھائی جس پر جیوری کے دیگر ممبران کے دستخط ثبت تھے۔ فہرست کے آخر میں بڑے ادیب کا فیصلہ بھی اسکی اپنی تحریر میں موجود تھا اور بڑے ادیب کے خون کے چند چھینٹوں نے خود اس کی اپنی تحریر کو گلنار کر رکھا تھا۔

بڑے ادیب نے نوجوان مصنف کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا۔ شاید اس دنیا کا وہ پہلا گناہ تھا جس کے انجام کار عاصی نے گناہ کرتے ہی خود اپنی سزا کا تعین بھی کر لیا تھا۔ گناہ فیصلے کی فہرست پر موجود تھا اور سزا بڑے ادیب کی لاش کی صورت میں کمرے کی میز پر بکھری پڑی تھی۔



لنڈا بازار (نظم)

ہمیشہ کی طرح آج بھی
سرما کی ان سرد شاموں میں
دفتر سے واپس لوٹتے ہوئے
میرے بڑھتے قدم
اس لنڈا بازار کے نکڑ پر
رُک سے گئے ہیں
ہر سال سوچتا ہوں کہ
اس بار آتے جاڑوں میں
دھانی رنگ کی ایک اُونی شال
تمہیں تحفے میں ضرور دونگا
جسے اوڑھ کر تم جب کبھی

ڈھلتی شام میں گھر سے نکلو گی
تو تمہارے گلابی عارض کا دمکتا رنگ
اس ڈھلتی شفق کو ماند کر دیگا
اور جسے اوڑھ کر کسی سہہ پہر جب
بھاپ اڑاتی پیالی کے عقب سے تم
مجھے شرارت بھری نظروں سے دیکھو گی
تو میرے من میں نہ جانے کتنے کومل سپنے
اس دھنک رنگ شام کی طرح اُتر آئیں گے
پر کیا کروں...... اے میری ہم نفس
میں ایک ادنیٰ سا کلرک ہوں
جو صرف خواب ہی بنتا رہتا ہے
کاش ان خوابوں کی اونی سلائیاں
تمہاری دھانی شال بھی بن پاتیں......
لیکن نہیں......
اب اور نہیں کہ
تم تو ہر سال آتی سردیوں میں
مجھے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیتی ہو
خود اپنے ہاتھوں سے بن کر
پورے سال کے پیسے جوڑ کر

مثلاً میرے گلے سے لپٹا
یہ نیا گرم مفلر، یہ سوئیٹر
اور میرے شانوں کو ڈھانپتا یہ کوٹ
یہ سب تمہی نے تو دیئے ہیں
تو کیا میں تمہارے لیے
ایک نئی شال بھی نہیں لے سکتا؟
نئی نہ سہی...... پرانی ہی سہی
ہاں یہ بھی سچ ہے کہ مجھے ہمیشہ سے
لنڈا بازار سے کچھ بھی خرید کر
کسی کو تحفہ دینا بہت معیوب لگتا ہے
کہ جیسے کچھ استعمال شدہ پرانے جذبے
کسی نئے رشتے کے رنگین کاغذ میں لپیٹ کر
کوئی کسی اپنے کو سونپ آئے
پر ہم سفید پوشوں کی بھی کیسی
کالی سیاہ مجبوریاں ہوتی ہیں
سو آج دل پر پتھر رکھ کر
میں نے بھی اپنے جھجکتے قدم
پرانی شالوں والی دوکان کی جانب
بڑھا ہی دیئے ہیں......

ماتھے پر ندامت کا پسینہ
آنکھیں جھکی ہوئی..... کہ
کوئی دیکھ نہ لے..... پہچان نہ لے
بس اسی گھبراہٹ میں میرا لرزتا جسم
ایک ریشمی وجود کی گٹھڑی سے ٹکرا گیا
بارش سے دھلی سڑک پر بہت سے
رنگ برنگے اون کے گولے
چند سوئیٹر، کچھ مفلر بکھر سے گئے
گھبرا کر اوپر دیکھا تو
دو مانوس سے نازک ہاتھ
جلدی میں سب سمیٹتے نظر آئے
وہی الجھی سی لٹ
وہی دل میں اُتر جانے والی خوشبو
وقت تھم گیا اور ہماری نظر ملی
تب میں نے یہ راز پا ہی لیا
کہ شاید یہ ساری دنیا ہی اپنے آپ میں
کچھ بوسیدہ رشتوں کا لنڈا بازار ہی تو ہے
جہاں ہم سب اپنے جذبوں کی
پرانی زنگ زدہ اُونی سلائیوں سے.....

رشتوں کے رنگین گولوں سے بنے سوئیٹر
ساری زندگی......ادھیڑتے رہتے ہیں
پھر بُنتے ہیں......اور بُن کر پھر سے
اُدھیڑ دیتے ہیں......

(ہاشم ندیم خان)



صلیبِ عشق (افسانہ)

اس کی عمر ابھی صرف سولہ برس تھی۔ عام حالات میں اس کی عمر کے لڑکے کالج کی ابتدائی زندگی کی نئی رنگینیوں میں کھونے کی تیاری میں مشغول ہوتے ہیں لیکن وہ تو ''زندگی'' لفظ سے ہی ناآشنا تھا۔ صرف سانس لینا ہی تو جینا نہیں ہوتا۔ اُسے بھی جیئے جانے کتنی صدیاں بیت چکی تھیں۔ اب تو وہ صرف سانس لیتا ہوا ایک جسم تھا اور آج ہائی کمانڈ کی طرف سے اُسے خود اپنے ہاتھوں اپنی اس چلتی سانس کی ڈور کو بھی توڑ دینے کا حکم نامہ آچکا تھا۔ اُسے اپنی سانس کا اپنے اس بوسیدہ جسم سے ناطہ کب اور کہاں توڑنا تھا، صرف یہی طے ہونا باقی رہ گیا تھا۔ شام تیزی سے ڈھل رہی تھی اور اس کے ''بڑوں'' کی جلد بازی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ معاملہ بس اب چند گھنٹوں کا ہی رہ گیا ہے۔

لیکن زندگی ہمیشہ سے اس سے یوں ناراض تو نہ تھی۔ وہ بھی کبھی زندہ تھا۔ اُس کی کٹی پھٹی یادداشت میں ابھی تک اپنی ماں کا وہ فرشتوں جیسا پرنور سکارف میں لپٹا چہرہ کسی کوندے کی طرح لپک جاتا تھا۔ جس کی مہربان گود میں چھپ کر وہ اور اسکے دیگر دو بہن بھائی زمانے کے ہر سرد و گرم سے بیگانے ہو جاتے تھے۔ وہ سب سے بڑا بھائی ہونے کے ناطے باقی دونوں سے کچھ زیادہ ہی ماں پر حق جتاتا تھا اور باقاعدہ اپنی ماں سے لپٹ کر دوسرے دو چھوٹے بہن اور بھائی کو للکارتا رہتا کہ دیکھو امی مجھ سے تم دونوں سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں اور پھر جب چھوٹی بہن اور بھائی منہ بسورتے تو ماں ہنس کر سبھی کو اپنے ساتھ لپٹا لیتی تھی۔

زندگی ہمیشہ سے اتنی تاریک اور بے رنگ بھی تو نہ تھی۔ اُسے تو بچپن ہی سے خاکوں میں رنگ بھرنے کا جنون تھا۔ اسکول میں اور گھر واپسی کے بعد وہ ہمہ وقت رنگوں کے ہجوم میں ہی گھرا رہتا تھا۔ اس کی ماں جانے

کہاں کہاں سے اُس کے پسند کے رنگ جمع کرتی اور پھر ماں بیٹا مل کر سارے گھر میں رنگولی ڈالتے۔ کبھی اس کی ڈرائنگ کی کاپی پر، کبھی اس کے لیے خصوصی طور پر بنوائے گئے چھوٹے سے کینوس پر اور کبھی اس کے کمرے کی دیواروں پر اُس کی ماں نے کبھی بھی اسے رنگوں سے کھیلنے سے منع نہیں کیا تھا، شاید اس لیے بھی کہ خود اس کی ماں کی زندگی سے قسمت نے سارے رنگ بہت جلد ہی نچوڑ لیے تھے۔ بہت سال پہلے جب اس کا چھوٹا بھائی ابھی اس کی ماں کی گود میں ہی تھا کہ ایک دن اچانک اس کی نازک ساعتوں میں اس کے باپ کے چیخنے چلانے کی آوازیں گونجیں۔ اس کی ماں بے بس سی باپ کے سامنے کھڑی آنسو بہاتی رہی اور پھر اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھائے اور ان تینوں کو لیے دوسرے شہر چلی آئی تھی۔

اس کی ماں کے سارے گہنے تو رفتہ رفتہ بک ہی چکے تھے لیکن ایسے وقت میں تعلیم کا وہ انمول زیور ہی اس کی ماں کے کام آیا جو جتنا خرچ ہوتا گیا، اتنا ہی بڑھتا گیا اور جس دن اس نے ساتویں سال میں قدم رکھا تھا اسی دن اس کی ماں کو پی ایچ ڈی کی اعلیٰ سند سے سراہا گیا تھا۔ اس کی ماں سر پر سکارف اوڑھے پاکیزگی کی مورت بنی جب گھر سے یونیورسٹی کے لیے نکلتی تو ان تینوں بہن بھائیوں کو بھی اسکول کے گیٹ پر چھوڑتی جاتی اور دوپہر کو چھٹی کے وقت دوبارہ وہ ان تینوں کو لینے کے لیے تپتی دھوپ میں ہاتھ کا چھاتہ بنائے باہر کھڑی ملتی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ تینوں ہی ماں کو دیکھتے ہی کس طرح چیختے چلاتے اور شور مچاتے اپنی مسکراتی ہوئی ماں کی جانب بھاگا کرتے تھے۔ تب ان تین معصوموں کو اس بات کا احساس ہی کہاں تھا کہ مائیں کتنی سایہ دار ہوتی ہیں اور اپنے مختصر سے وجود میں کتنا زیادہ اور گھنا سایہ سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔

گھر آنے کے بعد ماں ان کو کھانے کھلانے اور نہلانے دھلانے کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔ اکثر راتوں کو جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ اپنی ماں کو اُس کی نیلی ڈائری میں کچھ لکھتے ہوئے پاتا۔ اسے یاد تھا کہ ایک رات جب اس کی ماں نے ان تینوں کو کہانی نہیں سنائی تھی اور ڈائری میں کچھ نوٹ کرنے میں مصروف رہی تھی تو اگلے دن اس نے چڑ کر ماں کی وہ ڈائری کہیں چھپا دی تھی اور پھر اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جب اس کی ماں بالکل ہی ہلکان ہو کر گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی تھی تو اس نے جلدی سے اپنی بلی کے لیے بنائے گئے گھر کے پچھواڑے سے وہ ڈائری نکال کر اپنی ماں کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ تب اس کی ماں نے اُسے بتایا تھا کہ وہ اس ڈائری میں اپنی تحقیق کے بارے میں مختصر نوٹس اور فارمولے اتارتی ہے تا کہ اگلی مرتبہ اسے وہ موٹی موٹی کتابیں دوبارہ نہ پڑھنا پڑیں جن سے دن رات کی عرق ریزی کے بعد اس نے یہ سارا مواد کشید کیا تھا۔ تب اس نے ایک سرسری سی نظر اس ڈائری کے اوراق پر ڈالی تھی۔ لیکن اس کے پلے خاک بھی نہیں پڑا تھا۔ بس چند دائرے اور چند لکیریں تھیں جو ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اس نے جلدی سے اپنی ماں کے سر پر ہاتھ رکھ کر پکا وعدہ کیا تھا کہ آئندہ وہ کبھی بھی اپنی ماں کو اس طرح نہیں ستائے گا اور پھر

جلدی سے اس نے اپنی ننھی منی انگلیوں سے ماں کے بہتے آنسو بھی پونچھ ڈالے تھے۔ تب ماں اور بیٹا دونوں ہی ہنس دیئے تھے اور پوری کائنات مسکرا دی تھی۔

لیکن تقدیر کو سب کا سدا مسکرانا کہاں بھاتا ہے۔ اگلے ہی سال جب وہ ابھی صرف آٹھ سال کا تھا اور اپنی ماں اور بہن بھائی کے ساتھ اپنی سالگرہ کا کھلونا لینے کے لیے ایک ٹیکسی میں سوار اپنے چھوٹے سے گھر سے ابھی نکلا ہی تھا کہ راستے میں چند کرخت چہرے والے لوگوں نے ہاتھ دے کر ان کی ٹیکسی رکوالی۔ دفعتہً سامنے کھڑی بڑی سی گاڑی میں سے گورے رنگ کی ایک لومڑی نما عورت نکلی اور اُس نے بڑی بدتمیزی سے اس کی ماں کو ٹیکسی میں سے کھینچ کر باہر اتار دیا۔ تینوں بچے سہم کر ایک دوسرے سے ہی لپٹ گئے۔ ان کی ماں نے کچھ وضاحت کرنے کی کوشش کی تو اس گوری لومڑی نے وہیں بھری سڑک پر اس کی ماں کے چہرے پر چانٹوں کی بوچھاڑ کر دی۔ تینوں بچے ڈر کر رونے لگے۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنی بہن اور چھوٹے بھائی کو کیسے چپ کروائے کیونکہ خود اس کی آنکھوں سے خوف اور درد کے مارے آنسو لگاتار ٹپک رہے تھے۔ کوئی اس کی ماں کو تھپڑ مار رہا تھا اور آس پاس چلتی آتی جاتی ساری غلام روحیں صرف تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے ماں کی جانب بڑھنے کی کوشش کی لیکن ساتھ ہی کھڑے ہوئے ایک موٹے بھینسے نما شخص نے زور سے جھڑک کر اسے اپنی جگہ کھڑے رہنے کا حکم دیا اور وہ سہم کر ٹھٹھک سا گیا۔ اس کے ننھے بہن بھائی جلدی سے اس کے پیچھے چھپ گئے۔ جس بچے کی ماں کے گالوں پر چانٹے پڑ رہے ہوں تو اس کا درد وہی بچہ محسوس کر سکتا ہے۔ اس نے زندگی میں اس کے بعد بھی بہت مار سہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے ہاتھوں اور پیروں کی نازک جلد کو جلتے سگریٹ کے ذریعے بارہا داغا بھی گیا تھا...... لیکن اپنی ماں کے گالوں پر پڑنے والے ان تھپڑوں کی کاٹ، ان کی جلن اور ان کا بے رحم اور روح نچوڑ لینے والا درد وہ آج تک نہیں بھولا تھا۔ پھر اُس گوری لومڑی کے آس پاس کھڑے اس کے غلام محافظوں نے جھپٹ کر اس کی ماں کو ایک دوسری گاڑی میں اٹھا پٹخا اور اُسے اس کی بہن اور بھائی سمیت ایک دوسری گاڑی میں ڈال دیا گیا تھا اور دونوں گاڑیاں مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئی تھیں۔

وہ رات بھی اتنی ہی کالی اور بھیانک تھی جب اُسے یہ بتایا گیا کہ اس کی ماں ایک دہشت گرد ہے۔ بھلا کوئی ماں بھی کبھی دہشت گرد ہو سکتی ہے؟ اور پھر اس کا معصوم ذہن تو اس وقت اس لفظ سے ہی ناآشنا تھا۔ وہ تو بس چیخ چیخ کر ساری رات روتا رہا تھا کہ کوئی اُسے اس کی ماں اور بہن بھائیوں کے پاس چھوڑ آئے۔ جنہیں دیکھے ہوئے اب اسے پورے چوبیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ اس کی بہن بھائیوں کو راستے ہی میں اس سے جدا کر دیا گیا تھا اور اب وہ اکیلا ہی اس اندھیری چھوٹی سی لوہے کی کال کوٹھری نما کمرے میں سکڑا سمٹا سا بیٹھا ہوا تھا۔ اب تو اس کے ننھے ننھے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو بھی رفتہ رفتہ جمنے لگے تھے لیکن آج اس کی

ماں کے مہربان ہاتھ اس کے پھٹے ہوئے گالوں سے یہ نمکین زہر پونچھنے کے لیے موجود نہیں تھے اور پھر ماں کی عافیہ ہستی رفتہ رفتہ اس کی یادوں سے محو ہوتی گئی۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ اُسے جو لوگ یہاں لیکر آئے تھے ان سے اُسے اپنی ماں کی صرف اتنی خبر ملتی رہتی کہ اب اس کی ماں باقاعدہ ایک قیدی ہے اور اس کا نام اب صرف قیدی نمبر 650 رہ گیا ہے۔ لوگ اُسے بتاتے تھے کہ اس کی ماں کا نام بین الاقوامی دہشت گردوں کی فہرست میں درج ہے اور دنیا کے امن کو بچانے والے ''ٹھیکے داروں'' نے اس کی عفت مآب ماں کو مردوں کے قید خانے میں ہی بند کر رکھا ہے۔ وہ جس کے محرم ناخن کو ایک جھلک بھی آج تک کسی نامحرم نے نہیں دیکھی تھی آج اسے مخلوط غسل خانوں والے ایک زنداں میں سینکڑوں بھیڑیئے دن رات آتے جاتے اپنی بھوکی نظروں سے گھورتے رہتے تھے۔

وہ پہروں بیٹھا سوچتا رہتا تھا کہ اس کی بھولی سی معصوم ماں جو گھر میں کسی چھپکلی کی موجودگی کا سن کر ہی سراسیمہ ہو جاتی تھی وہ بھلا ان درندوں کا وحشیانہ تشدد کیسے برداشت کرتی ہوگی۔ جب انہوں نے اس کی ماں کے نرم ملائم ہاتھوں اور پیروں کے ریشے سے اس کے ممتا بھرے ناخن علیحدہ کیے ہوں گے تو وہ درد کی انتہا سے کتنی بار بے ہوش ہوئی ہوگی؟ جب اس کے مقدس بدن پر جلتے ہوئے انگارے رکھے گئے ہوں گے تو وہ کس کرب سے کراہی ہوگی؟ جب اس کے نور بھرے ماتھے اور سر پر شدید کھولتے ہوئے پانی کی دھار انڈیلی گئی ہوگی تو وہ کس قدر چلائی ہوگی؟ جب اس کی کوٹھڑی میں رات کو اچانک اُس کے سوتے وقت زہریلے بچھو اور چھوٹے سنپولیے چھوڑ دیئے جاتے ہوں گے تو وہ کیسے ساری ساری رات لرزتی کانپتی ایک ٹانگ پر کوٹھڑی کے کونے میں سکڑی سمٹی کھڑی رہ کر پوری رات گزارتی ہوگی؟ اُسے تشدد کے یہ سارے طریقے اس لیے بھی پتہ تھے کیونکہ وہ جہاں قید تھا اس قید خانے میں اپنے آس پاس وہ اُن درندوں کو روزانہ یہ سارے حربے ان معصوم لوگوں پر آزماتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا جو نہ جانے کہاں کہاں سے اُٹھا کر ان بندی خانوں میں لا کر قید کر دیئے گئے تھے۔ اُس کی معصوم آنکھیں اور نازک احساسات جو ابھی ٹھیک طرح سے کھلے بھی نہیں تھے اپنے سامنے دن رات یہ تماشہ ہوتے دیکھتے اور رفتہ رفتہ اس کے اندر کا معصوم بچہ مرتا گیا اور وہ ایک مشین میں بدلتا گیا ایک ایسی مشین جو سب کچھ دیکھتی ہے، سنتی ہے لیکن کچھ محسوس نہیں کر سکتی۔

پھر ایک دن اُسے خبر ملی کہ اس کی ماں اپنے درد کی آخری حد سے بھی گزر گئی ہے اور اپنے ہوش و حواس سے بیگانی ہوگئی ہے۔ لیکن اپنے دشمنوں کے لیے شاید وہ ایک پاگل عورت کے روپ میں بھی اب تک اتنی ہی خطرناک تھی تبھی انہوں نے اُسے آزاد کرنے کے بجائے اسے مزید اندھیرے، سردی سے ٹھٹھرتے چوہے کے بل نما پنجروں میں قید کر رکھا تھا جس کی تنگ راہداریوں میں دن کے وقت بھی رات رہتی تھی اور جن کی سکڑی سمٹی روشوں میں سے ایک اکیلا انسان بھی بنا دیواروں سے رگڑ کھائے نہیں گزر سکتا تھا۔

لیکن اسے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئی کہ ماں تو سب کی سانجھی ہوتی ہے۔ وہ اُن کے نزدیک چاہے کچھ بھی سہی لیکن وہ اُس کی تو ماں تھی، کوئی بھی کسی کی ماں کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ دنیا کا کوئی بھی قانون ماں کی ممتا اور بیٹے کے رشتے کو جدا نہیں کر سکتا پھر اُس کے معصوم بچپن کو کیوں روندا گیا؟ کیوں ایک بچے کو اس کی ماں سے جدا کر دیا گیا؟ اگر اس کی ماں کو کسی ناکردہ گناہ کی سزا ہی دینا مقصود تھا تو پھر اُسے اور اُس کی ماں کے دوسرے دو بچوں کو اُن کی ماں کے ساتھ ہی کیوں نہیں قید کر دیا گیا؟ گوری لومڑی اور اس کے آقاؤں کے نزدیک اگر اس کی ماں مجرم تھی تو اس کی سزا انہوں نے اس ماں کے تین بچوں کو کیوں دی؟ کیا دنیا کی کوئی بھی عدالت اُن کے بچپن کا صرف ایک لمحہ بھی واپس لوٹا سکتی تھی؟ اور کیا آخرت ہی میں اس زیادتی کا کوئی بدل ممکن تھا؟

پھر ایک دن اچانک اُس قید خانے پر کسی گروہ نے حملہ بول دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں کسی نقاب پوش نے اس کا ہاتھ تھاما اور وہ لوگ اُسے نکال کر لے گئے۔ لیکن اسی کے لیے یہ سارا ہنگامہ صرف آقاؤں کی تبدیلی کا مظہر ثابت ہوا۔ تب پتہ چلا کہ یہ لوگ اس کی ماں کے دشمنوں کے دشمن ہیں اور اس کی ماں پر انہی لوگوں کی معاونت کا الزام تھا۔ اب یہ نئے آقا دن رات اسے اس بات کا احساس دلاتے رہتے تھے کہ اس کی ماں کی زندگی برباد کرنے والے کسی رعایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اب اُسے انتقام کے لیے کمر کس لینی چاہیے۔ اس کی زندگی مذہب کی دی ہوئی ایک مقدس امانت ہے اور یہ جسم بھی عارضی طور پر مستعار دیا گیا ہے۔ اس کی یہ برین واشنگ دن رات جاری رہتی اور وہ لوگ ہی مختلف ذرائع سے اُسے اس کی ماں کے ساتھ ہونے والے بہیمانہ سلوک کی داستانیں سناتے رہتے۔ کبھی کبھی تو اُسے یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کی ماں کے دشمن اور یہ نام نہاد نئے آقا ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ بھلا اس کی معصوم اور بھولی ماں کا ایسے انتہا پسندوں سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ اُسے تو غم روزگار نے کبھی اتنی فرصت بھی نہیں دی تھی کہ کبھی فرصت سے اپنے بچوں کو لوری ہی سنا دے۔

اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کے آس پاس یہ سبھی روحیں خود اپنا سودا طے کر چکی ہیں اور اب ان جسموں میں قید یہ سبھی غلام روحیں ہیں جنھیں اپنے اوپر بیٹھے اس ہاتھ کا بھی پتہ نہیں جو ان سب کی ڈور ہلاتا رہتا ہے۔

وہ اپنے خیالات میں گم تھا کہ اچانک اس کے آہنی قید خانے کا دروازہ کھلا اور اس کے نئے آقاؤں میں سے ایک نے اُسے آ کر خوش خبری دی کہ آخر کار اس گناہوں بھرے جسم سے اس کا رابطہ ٹوٹنے کی سہانی گھڑی آ ہی گئی ہے اور اس کی خوش نصیبی ہے کہ اسے اپنی ماں کے دشمنوں میں سے ایک اہم ٹولے کو اپنے آپ سمیت ختم کرنے کا ایک سنہری موقع دیا جا رہا ہے۔ اسے ایک انجکشن لگایا گیا جس سے اس کے حواس بالکل ہی جامد ہو گئے اور وہ صرف ایک سننے اور عمل کرنے والی مشین میں تبدیل ہو گیا۔ انجکشن لگاتے وقت اُسے یہ بھی بتایا گیا

کہ یہ عمل اس لیے ضروری ہے کہ کہیں آخری وقت پر اس کے قدم ڈگمگا نہ جائیں۔ اسے بتایا گیا کہ اُسے صرف اس ہجوم کی جانب بڑھنا ہے جہاں اس کا رہبر اُسے اشارہ کرے گا اور پھر مناسب وقت پر ریموٹ کا بٹن دبانے کا فریضہ خود اس کا رہبر سرانجام دے گا۔ جس وقت اُس کا نیا آقا اُسے اس صراط مستقیم پر چلنے کے بعد حاصل ہونے والی لامحدود نعمتوں کا ذکر کر رہا تھا تب وہ کم سن ساذہن لیے بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ شاید اس کے بچھڑے ہوئے بہن اور بھائی بھی کہیں اسی طرح کے آقاؤں کے جھرمٹ میں بیٹھے اپنے سینے پر بیلٹ بندھوا رہے ہوں گے۔

اسے ٹھیک وقت پر اس علاقے میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ تقریب ہونی تھی۔ اُس کے رہبر نے دور سے اشارہ کر کے اُسے اس ہجوم کا ٹھکانہ بتایا اور اپنے آپ سے ایک خاص فاصلے پر رکھ کر اُسے روانہ کر دیا۔ ہجوم کی طرف بڑھتے ہوئے بھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کبھی ایسی ہی بڑی بڑی تقریبات میں اس کی ماں کی لیاقت اور علم کو سراہا جاتا تھا۔ اسٹیج پر بیٹھی عورت بھی تو کسی کی ماں ہی ہوگی بلکہ چند لمحے کے لیے تو اُسے وہ بالکل اپنی ماں جیسی ہی دکھائی دی تھی۔ اس کے رہبر نے دور سے اسے اشارہ کیا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے منہ سے اس کا آخری لفظ نکلا...... ماں...... ایک زوردار دھماکا ہوا اور نہ جانے کتنی ماؤں کے جسم ریزہ ریزہ ہوگئے۔

اگلے دن اخبار کی شہ سرخی تھی۔

''سات سال کی گمشدگی اور قید کے بعد مشہور پی ایچ ڈی عالمہ ایک خودکش دھماکے میں شہید، شنید میں آیا ہے کہ وہ اپنی اس پہلی کانفرنس میں بہت سے اہم رازوں سے پردہ اٹھانے والی تھیں جبکہ حکومت نے ایک بار پھر اپنے اس موقف کا اعادہ کیا ہے کہ دہشت گردی سے آہنی ہاتھوں سے نپٹا جائے گا......''



کیفے فراق (افسانہ)

ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد ہمارے ملک کے مختلف شہروں میں بہت سے ایرانی ہوٹل اور ریستوران کھل چکے تھے جن کی وجہ سے مقامی ریستوران والے کافی بھنائے ہوئے رہتے تھے کیونکہ ایرانی ہوٹل اور کیفے عام طور پر بے حد صاف ستھرے، رنگین شیشوں سے مزین اور بہتر خدمت کرنے والے عملے کے حامل تھے لہٰذا پرانے گاہکوں کی بہت بڑی تعداد ان ریستورانوں کی جانب متوجہ ہو چکی تھی اور مقامی کیفے اور ریستوران رفتہ رفتہ ویران ہوتے جا رہے تھے۔ ایسا ہی ایک ایرانی ''کیفے فراق'' ہمارے صدر کے علاقے میں بھی کھل چکا تھا اور جب صبح سویرے حمد و تلاوت کے بعد ریستوران کے پرانے دو بینڈ کے ریڈیو اور ریکارڈ سے ''ملا محمد جان'' اور گھوگھوش کا ''من آدم'' نشر ہوتا تو آس پاس کے تمام دوکاندار بھی سر دھننے لگتے تھے۔ ان دنوں محلے کے نوجوانوں کے گروہ بھی پرانے نکڑ والے سلو کے ہوٹل کو چھوڑ کر نئے انڈین اور ایرانی ریکارڈ سننے کے شوق میں دن بھر کیفے فراق کی کرسیاں توڑتے رہتے اور دن بھر چائے اور پان کی فرمائش چلتی رہتی تھی۔ خاص طور پر شام چار بجے کے بعد تو کیفے کے ہال میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں بچتی تھی۔ چائے کیفے کا ایرانی بیرا ''فرہاد'' مہیا کرتا اور پان باہر فٹ پاتھ سے منسلک حاجی مصطفیٰ کے لکڑی والے کھوکھے سے سپلائی ہوتے رہتے تھے۔ فرہاد اپنے نام کی طرح رنگین اور عاشق مزاج نوجوان تھا جو انقلاب کے بعد پابندیوں سے گھبرا کر یہاں دوڑا چلا آیا تھا اور اب اس ایرانی ریستوران میں بیرا گیری کر کے گزر بسر کر رہا تھا۔ محلے کے لڑکے اُس کی فارسی آمیز اردو سے بہت لطف اندوز ہوتے اور اُن کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ کیفے کا مالک حاجی علی مشہدی جو خود کو فراق کے تخلص سے پکارا جانا زیادہ پسند کرتا تھا۔ دن بھر رضا شاہ پہلوی کے ایرانی دور کو یاد کر کے آہیں بھرتا

رہتا اور گھوگوش اور خانم نامی گلوکاراؤں کی تصاویر کو دیکھ کر پرانی یادوں میں کھویا رہتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کی پچاس بہاریں ایران کے شہر مشہد میں گزار چکا تھا اور اب یہ ''یادِ ماضی'' اُس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھی۔ وہ اپنی بیوی اور بچے کو انقلاب میں گنوا چکا تھا اور اب صرف تنہائی اور یادیں اُس کا مقدر تھیں۔ وہ صبح سویرے کیفے کھولنے پہنچ جاتا جہاں فرہاد اس سے پہلے موجود ہوتا چونکہ وہ کیفے کی دوسری منزل پر بنی دو چھتی میں ہی رہتا تھا۔ یہ خصوصی اجازت اس کے مالک فراق نے اُسے تب دی تھی جب فرہاد نے ایران سے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ کیفے کی نوکری کے لیے علی مشہدی کے پاس آکر درخواست گزاری کی تھی۔ صبح کیفے کے لکڑی کے پرانے دروازے کھلتے ہی فرہاد دوسرے دو بیروں کے ساتھ مل کر سب سے پہلے ریستوران کے فرش کو پانی سے دھلواتا اور تمام شیشوں کا رگڑ رگڑ کر صاف کرواتا تھا۔ اتنی دیر میں علی مشہدی اپنی تلاوت اور دعا سے فارغ ہو کر کاؤنٹر سنبھال چکا ہوتا اور تب فرہاد اپنے مالک کی اجازت سے صبح ناشتے کی تیاری کے دوران اپنی پسند کے ریکارڈ بدلتا رہتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ریڈیو پر ریڈیو تہران کی اردو سروس بھی چلتی رہتی۔ کچھ ہی دیر میں دودھ لانے والی گاڑی دودھ کی بوتلیں اتار جاتی اور شہر کی بڑی بیکری سے انڈے اور ڈبل روٹی کی ٹوکریاں بھی پہنچ جاتیں۔ کیفے کے بڑے پرانے ایرانی فرج میں رکھی مکھن کی ٹکیاں اور شیر مال ''بن مسکہ'' تلنے کے کام آئیں اور کچھ ہی دیر میں کیفے کی فضا چائے کی سوندھی اور ناشتے کی کراری خوشبو سے مہکنے لگتی اور آس پاس کے مکین ناشتے کی خریداری اور ایک پرلطف ناشتے کا مزہ لینے کے لیے ''کیفے فراق'' کے وسیع دروازوں سے اندر داخل ہونے لگتے تھے۔ مشہدی اپنے چہرے پر روایتی ایرانی خوش دل مسکراہٹ سجائے ان سب کا استقبال کرتا اور یوں ایک خوشگوار صبح سے دن کا آغاز ہو جاتا۔ محلے کے کچھ بوڑھے اپنی چھتریاں ٹیکتے کیفے میں آکر بیٹھ جاتے اور ایرانی قہوے کے ساتھ مصری یا ایک ڈلی اپنے کلوں میں دبائے کئی کئی کپ قہوہ اُنڈیل جاتے۔ ساتھ ساتھ لتا اور مکیش یا رفیع کے پرانے نغموں کے ریکارڈ کی فرمائش بھی جاری تھی۔ اسی ہنگامے میں صبح دن میں ڈھل جاتی اور دوپہر کے کھانے کے وقت ہو جاتا۔ نرم گرم ایرانی کلچوں کے ساتھ کم مرچ اور مصالحے والی سبزی یا ترکاری پیش کی جاتی اور ایرانی چلو کباب اور سادہ چاولوں کی پلیٹیں میزوں پر سجنے لگتیں۔ آس پاس کے فلیٹوں اور مکانوں سے بچے ہاتھوں میں دستر خوان لیے گرم کلچے لینے کے لیے پہنچ جاتے اور زیادہ تر بچی ہوئی ریزگاری سے ایرانی ببل گم، شیک اور آفندی سے اپنی جیبیں بھر لیتے تھے۔ کچھ دیر بعد شام کی چائے کا وقت ہونے لگتا اور سہ پہر چار بجے تک کیفے کی خالی کرسیاں محلے کے فارغ اور من چلے نوجوانوں کی ٹولیوں سے پر ہو چکی ہوتیں۔ اس میں کچھ ہاتھ کیفے فراق کی مزیدار چائے اور ماحول کا تھا تو کافی زیادہ شام ساڑھے چار بجے روزانہ گھر کے ناشتے اور شام کی چائے کا سامان خریدنے آنے والی اُس مہ جبیں کا تھا جس کا نام بھی وہاں شاید کسی کو معلوم نہ تھا۔ یہ حادثہ ابھی چند روز پہلے ہی وقوع پذیر ہوا تھا جب صدر کی تیسری گلی میں یہ ایرانی خاندان ہجرت کے

بعد منتقل ہوا تھا۔ لڑکی اپنی ادھیڑ عمر کی ماں کے ساتھ ایک چھوٹے بچے کا ہاتھ تھامے کیفے کے ہال میں داخل ہوتی تو بہت سوں کی نبض اور دل کی دھڑکن رک جاتی تھی۔ بوڑھے کھنکار کر خاموش ہو جاتے۔ جوانوں کی سانس بولنے لگتی اور سارے ماحول پر رنگینی سی چھا جاتی۔ سرگوشیاں تیز ہونے لگتیں اور خاموشیاں گنگنانے لگتیں۔ فرہاد کے بقول وہ چھوٹا لڑکا اس لڑکی کا بھائی تھا اور ان کا باپ ایران کے انقلاب میں قید ہو کر وہیں جان دے بیٹھا تھا۔ بڑا بھائی اور گھر کا واحد کفیل بیٹا بھی لاپتہ تھا لہٰذا لڑکی کی ماں گھر میں ایرانی کشیدہ کاری اور کشن تکیے وغیرہ سی کر گھر کا خرچہ اُٹھاتی تھی۔ لڑکی ایران کی تہران یونیورسٹی میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر آئی تھی اور فی الحال ماں کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ فرہاد کی دھڑکنیں تو اُسی روز اتھل پتھل ہو چکی تھیں جس دن پہلی مرتبہ اس ماہ رو نے اپنے چہرے کا سیاہ نقاب اُلٹ کر اُس سے ایرانی مکھن کی ٹکیہ کی فرمائش کی تھی۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی اردو سن کر فرہاد نے جلدی سے اُسے فارسی میں یہ اطلاع دی کہ وہ بھی اُسی کا ''ہم سایہ'' ہے اور وہ فارسی میں بات کر سکتی ہے۔ لڑکی کی ماں نے بہت دنوں بعد اپنی مادری زبان سنی تو وہ بھی اپنے آنسو نہ روک سکی اور شستہ فارسی میں سلام جواب سن کر علی مشہدی کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہی تکلف کے سارے پردے اُٹھ گئے اور علی مشہدی نے مہمان نوازی کی انتہا کر دی۔ اس نے پہلے روز ماں بیٹی سے کسی بھی قسم کی قیمت وصول کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ یہ اس کی غیرت کے خلاف ہے۔ ماں نہ نہ ہی کرتی رہ گئی لیکن مشہدی نے فرہاد کے ہاتھ بہت سی کھانے پینے کی چیزیں لڑکی کے ہاتھ میں پکڑی پلاسٹک کی ایرانی ٹوکری میں رکھوا دیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس دوران مشہدی نے فرہاد کو بولنے کا ذرا بھی موقع نہ دیا بلکہ ایک آدھ بار اُسے ہلکی سی جھاڑ بھی پلا دی کہ وہ مہمانوں کے رتبے اور مرتبے کو مدنظر رکھتے ہوئے منہ کھولا کرے۔ لڑکی کی آنکھوں میں شکریے اور احسان مندی کی ایک جھلک نے ہی مشہدی کو نہال کر دیا۔ پھر یوں ہونے لگا کہ روز ساڑھے چار بجے شام پورا ''کیفے فراق'' سراپا انتظار ہو جاتا اور جب تک وہ گل رخ وہاں سے ہو کر واپس نہ چلی جاتی تب تک کیفے کی فضا پر ایک عجیب سی بے چینی طاری رہتی تھی۔ جیسے کوئی اہم فریضہ چھوٹ گیا ہو.... اور پھر جب وہ آ کر چلی جاتی تو سب ہی کو اپنے بھولے ہوئے کام یاد آنے لگتے اور کیفے پھر سے جاگ اٹھتا تھا۔ شروع کے چند دن ماں بھی بیٹی کے ساتھ آتی رہی اور پھر راستوں اور لوگوں سے جان پہچان کے بعد بیٹی تنہا آنے لگی۔ چھوٹا بھائی البتہ اب بھی اس کی انگلی تھامے رہتا۔ محلے کے منچلوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں اور اب رات کے آوارہ گرد بھی سہ پہر کو ہی شام کرنے لگے تھے۔ میں مشہدی کو اپنی ایران میں بتائی جوانی کی ہر سہانی شام بری طرح یاد آنے لگی تھی اور جس دن وہ نازک اندام اپنا پہلا قدم کیفے کے فرش پر دھرتی ٹھیک اُسی گھڑی اس کے اندر کے تمام گھنگھرو بجنے لگتے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال فرہاد کا بھی تھا مگر اس کا سخت گیر مالک اب ایسے مواقع پر اُسے کاؤنٹر کے گرد پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔ شاید اُسے بھی فرہاد کی آنکھوں میں جلتی وہ چمک نظر آ چکی تھی جو آگے چل کر کسی رقیب کی آنکھوں کی

روشنی ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن مشہدی اب مزید کوئی ''فراق'' سہنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ موقع ملتے ہی اپنے دل کی بات وہ اس قاتل جاں کے گوش گزار کر دے گا۔ مشہدی کی صحت پچاس کے پیٹے میں بھی قابل رشک تھی اور اتنی بڑی جائیداد کا وہ تن تنہا مالک تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی درخواست رد نہیں کی جائے گی۔ پھر ایک روز اس نے موقع پا کر تنہائی میں لڑکی سے اس کی ماں کا حال پوچھنے کے بہانے اس کا نام بھی پوچھ لیا۔ لڑکی شرما سی گئی اور دھیرے سے بولی ''فرح خانم''...... مشہدی کے حلق میں شہد کی مٹھاس گھل گئی۔ ''فرح......'' ہاں......اس سبک اور نازک اندام کا کچھ ایسا ہی نام ہونا چاہیے تھا۔ ''فرح''......کتنا اچھا نام تھا اس کا......

اب علی مشہدی گاہے بگاہے فرح کی ماں خانم ذکیہ کا حال احوال پوچھنے کے بہانے فرح سے بات چیت کا سلسلہ بڑھانے لگا تھا۔ فرح جب بھی شرماتے ہوئے مشہدی کے سوالوں کے جواب دیتی تو دور کھڑے کسی کام میں مصروفیت کا دکھاوا کرتے فرہاد کے سینے پر کئی سانپ لوٹ جاتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اپنی غربت کو خوب کوستا اور رات بھر فٹا فٹ امیر ہونے کے کئی منصوبے بنا کر توڑتا رہتا۔ اس کی نظر آج کل مشہدی کے گلے پر بھی لگی رہتی تھی جو کاؤنٹر کے پیچھے ایک خفیہ دراز بھی تھا جہاں کیفے کی مہینے بھر کی کمائی جمع رہتی تھی۔ مشہدی کا معمول تھا کہ وہ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو سارے مہینے کی جمع شدہ کمائی میں سے اگلے ماہ کا خرچہ نکال کر باقی ماندہ پیسے قریبی بینک میں جمع کرا دیتا تھا۔ جب سے فرح ان کے کیفے آنے لگی تھی فرہاد کا کئی بار جی چاہا تھا کہ وہ چپکے سے گلے میں سے تمام روپے نکال کر فرح کے ہاتھ پر رکھ دے کہ ''یہ لو......مگر اس عاشق مزاج بوڑھے سے دور رہا کرو......'' یا پھر وہ یہ سوچتا رہتا تھا کہ کسی روز لمبا ہاتھ مارنے کے بعد وہ فرح اور اس کی ماں کو لے کر اس شہر ہی سے کہیں دور چلا جائے گا۔ اسے یقین تھا کہ فرح اس کی پیش کش ضرور قبول کر لے گی۔ وہ ابھی نوجوان تھا، خوبرو تھا، پھر کیا ہوا کہ فی الحال غربت اس کے گلے کا طوق بنی ہوئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اگر فرح جیسی دلبر کا ساتھ ہو تو وہ ساری دنیا کو فتح کر سکتا ہے۔ خود اُسے کئی بار یہ شبہ ہوا تھا کہ فرح اُس کی جانب دیکھ کر مسکائی ہے۔ مگر مشہدی کی سخت گیر نظریں کبھی بھی جی بھر کر فرہاد کو فرح کا حسن نہارنے نہیں دیتی تھیں۔ اب تو وہ ہر روز کسی نہ کسی بہانے سے شام ساڑھے چار بجے کے قریب فرہاد کو کیفے سے باہر کسی کام سے بھجوانے لگا تھا اور یہ عمل فرہاد کے لیے کسی تازیانے سے کم نہ تھا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ اس کا مالک اُسے کسی بھی طور فرح سے دور رکھنا چاہتا ہے اور یہیں سے اس کے اور مشہدی سے انتقام کا جذبہ پنپنے لگا تھا...... ورنہ اس سے پہلے ہمیشہ مشہدی کے احسانوں کا بوجھ اُسے سانپ بن کر ڈستا رہتا تھا۔ دن گزرتے گئے اور فرح کے عشق کا بھوت فرہاد اور مشہدی کے سروں پر ایک رنگین خواب بن کر ناچنے لگا۔ اس روز اتفاق سے کئی دن بعد علی مشہدی کو اچانک کسی ضروری کام سے شہر کی تحصیل تک جانا پڑ گیا اور فرہاد دوپہر ہونے سے پہلے ہی گڑگڑا کر خدا سے

دعا کرنے لگا کہ کسی بہانے اس کے مالک کی واپسی میں اتنی تاخیر ہو جائے کہ وہ شام ساڑھے چار بجے تک واپس لوٹ کر نہ آسکے۔ آخر قدرت کو فرہاد پر رحم آ ہی گیا اور مشہدی کو دیر ہو گئی۔ فرح اپنے وقت پر سیاہ اسکارف لپیٹے، لمبے نیلے اسکرٹ میں ملبوس کیفے میں داخل ہوئی تو فرہاد کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور نظریں فرح کے نازک سراپے پر جم گئیں۔ واقعی، خدا جب حسن دیتا ہے، نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ وہ بھی نزاکت کا پیکر لگ رہی تھی۔ نرم و نازک گلابی پاؤں ایرانی سینڈلز سے جھانک رہے تھے اور ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں آج بھی اُسی نفاست سے مخصوص ٹوکری کو گرفت میں لیے ہوئے تھیں۔ ہال میں حسب معمول تیز سرگوشیوں کے بعد سناٹا سا چھا گیا۔ اُس نے اپنی گھنیری سیاہ پلکیں اٹھائیں۔ فرہاد اس کی سیاہ آنکھوں کی جھیلوں میں غوطہ زن ہو گیا۔ ''کیا آج آقائے مشہدی موجود نہیں ہیں......؟'' فرہاد کو ہوش آیا...... ''نہیں......وہ کسی ضروری کام سے باہر گئے ہیں......'' فرح نے پلکیں جھپکیں...... ''اوہ......اچھا......میرا سامان باندھ دیں گے آپ......'' فرہاد نے کسی خواب کے عالم میں جلدی جلدی بیکری اور ناشتے کا سامان باندھ کر ٹوکری میں ڈال دیا۔ فرح شکریہ ادا کر کے پلٹی۔ چھوٹے بھائی نے ہاتھ میں پکڑے پیسے فرہاد کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔ فرہاد کو یوں لگا جیسے اس کی قسمت پلٹ کر واپس جا رہی ہو۔ اُس نے آخری بازی کھیلنے کا فیصلہ کر لیا ''اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں خانم'' فرح نے پلٹ کر فرہاد کو دیکھا۔ اس کے پرنور چہرے پر سیاہ نقاب آفت ڈھا رہا تھا۔ فرہاد نے بات جوڑی۔ ''دراصل آپ کا روز یہاں آنا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ لوگ جانے کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں۔ یہاں کے ماحول کے بارے میں تو آپ کو خوب علم ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں روزانہ شام کو یہاں سے فراغت کے بعد آپ کا سامان خود آپ کے گھر پہنچا دیا کروں گا، دراصل آپ میری ہم قوم ہیں فرح خانم ......اور میں آپ کی تعظیم کے بارے میں فکرمند رہتا ہوں......'' فرح کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ فرہاد کا دل چاہا کہ وہ اس کے گالوں میں پڑنے والے دو گڑھوں میں ڈوب جائے۔ ''تشکر......بہت مہربانی......آپ نے میرے بارے میں اتنا سوچا......ٹھیک ہے میں موموجان (والدہ) سے بات کر کے آپ کو بتا دوں گی......آپ کا بہت شکریہ......'' فرح کی نظر ایک لمحے کے لیے فرہاد کی نظر سے ٹکرائی اور فرہاد نہال ہو گیا۔ اسے فرح کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ اپنے لیے تشکر کے وہ جذبات نظر آئے جو وہ ہمیشہ مشہدی کے لیے دیکھا کرتا تھا۔ آج اُسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ابھی اس دنیا میں کوئی مقام رکھتا ہے۔ فرح کے جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک اُسی کی آنکھوں کے خمار میں ڈوبا رہا۔ مشہدی کے چہرے پر بھی اس روز ایک عجیب سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فرہاد نے اُسے فٹ پاتھ والے پان ہاؤس کے حاجی مصطفیٰ سے بات کرتے ہوئے سنا کہ مشہدی آج فرح کے گھر سے ہو کر آ رہا ہے۔ اور یہی اس کی تاخیر کی وجہ تھی۔ مصطفیٰ سے مشہدی کافی بے تکلف تھا اور اس نے دبے لفظوں میں اس بات کا انکشاف کیا کہ وہ جلد ہی فرح کی ماں کو فرح کے رشتے کا باقاعدہ پیغام بھی

بھجوانے والا ہے۔ فرہاد کی دنیا اندھیر ہونے لگی۔ آج ہی تو اس کے اندر جینے کی ایک نئی امنگ جاگی تھی مگر قسمت اس قدر جلد اس کی تقدیر کے پتے اُلٹ دے گی، ایسا اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔ فرہاد نے دل میں پکا عہد کر لیا کہ اب وہ مزید تاخیر کی غلطی نہیں کرے گا۔ اُسے یقین تھا کہ فرہاد کی ماں چاہے فرح کے رشتے کے لیے ہاں بھی کر دے لیکن فرح دل سے کبھی مشہدی کی نہیں ہو پائے گی۔ کیونکہ اس نے آج فرح کی آنکھوں میں اپنے لیے جلتے ہوئے دیئوں کی جوت دیکھ لی تھی اور اب وہ کسی بھی قیمت پر فرح کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اتفاق سے علی مشہدی نے کسی جائیداد کی خرید وفروخت کے سلسلے میں آج ہی تحصیل جاتے ہوئے ایک بڑی رقم بینک سے نکلوائی تھی جو اس نے فرہاد کے سامنے ہی گلے میں رکھ دی تھی۔ فرہاد نے اسے بھی قدرت کی جانب سے ایک غیبی مدد کا اشارہ سمجھا اور رات ہوتے ہی اس نے گلے کا صفایا کر دیا اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے کیفے کی چابیاں اپنے ساتھی کے گھر چھوڑ کر خود کہیں رفو چکر ہو گیا۔ صبح مشہدی نے کیفے پہنچ کر جب فرہاد کی جگہ دوسرے نوکر کو ہال کی صفائی کرتے دیکھا تو اس نے اسے معمول کی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ فرہاد پہلے بھی فلم اور تھیٹر دیکھنے کے لیے رات رات بھر کیفے سے غائب رہتا تھا اور واپس آ کر مشہدی سے اپنی بیماری کے وہی ہزار بہانے کرتا تھا جو اس وقت اس کا دوسرا نوکر بیان کر رہا تھا۔ مشہدی کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ ایسے موقعوں پر چابیاں کسی دوسرے نوکر کے حوالے کر جاتا تھا۔ مشہدی نے سوچ رکھا تھا کہ آج وہ بارہ بجے دن سے پہلے ہی رقم جائیداد کے مالک کے حوالے کر آئے گا۔ دراصل اس نے یہ بات ابھی تک سب سے چھپا رکھی تھی کہ وہ فرح کی گلی میں ہی اس کی ماں اور بیٹی کے لیے ایک نیا مکان خرید رہا ہے جہاں وہ شادی کے بعد فرح کو رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا ہوا تھا کہ جس دن وہ فرح کی ماں سے ''ہاں'' سنے گا اسی لمحے گھر کی چابیاں فرح کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ مشہدی انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک فرح کو اپنے مخصوص سیاہ اسکارف میں لپٹے کیفے میں داخل ہوتے دیکھ کر اُس کی سانسیں بند ہونے لگیں۔ فرح آج حد سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ شاید فرح کی ماں نے اسے دبے لفظوں میں علی مشہدی کی جانب سے دیا گیا سندیسہ سنا ڈالا تھا۔ فرح مشہدی کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تو اس کی نظریں جھکی ہوئی اور لب کانپ رہے تھے۔ ''آقائے مشہدی......آپ کے ہمارے خاندان پر پہلے ہی بہت احسان ہیں...... میں کس طرح آپ سے اپنے تشکر کا اظہار کروں......؟'' مشہدی کی سماعتوں میں رس گھل گیا۔ ''نہیں نہیں...... اس میں بھلا شکریے کی کیا بات ہے......؟...... میں نے تو جو بھی کیا...... اپنا فرض سمجھ کر کیا......اور میں اب آپ کے خاندان کو اپنا ہی خاندان سمجھتا ہوں......اسی لیے تو کل......'' فرح نے اس کی بات کاٹی ''جی...... مجھے مومو جان نے سب بتا دیا ہے...... کہ آپ نے کل دبے لفظوں میں ہمارے خاندان سے رشتہ جوڑنے کی بات کی ہے......میں اسی لیے یہاں آئی ہوں...... کیونکہ مومو جان خود یہ بات آپ کے سامنے نہیں دہرا سکتی تھیں......مومو جان کو آپ کا رشتہ قبول ہے......اور سچ تو یہ ہے

کہ ہم رات بھر آپس میں یہ ذکر کرتے رہے ہیں کہ آج کل کے اس دور نا پرسان میں آپ جیسا نیک اور شریف انسان بھلا کہاں ملتا ہے۔ مومو جان بھی بہت تنہا ہیں...... انہوں نے میری خاطر دوسری شادی نہیں کی لیکن اب میں اپنا بندوبست وگزارہ خود آپ کرسکتی ہوں...... آپ کا عقد مومو جان سے ہو جائے تو میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جاؤں گی......''

فرح اپنی دھن میں نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی لیکن علی مشہدی کے سپنوں کا محل اس زور سے ٹوٹ کر گرا تھا کہ اُس کے شور سے اس کی سماعتیں شل ہو چکی تھیں۔ اور دھول اور مٹی کے طوفان سے بصارت معطل ہو کر رہ گئی تھی۔ فرح کی ماں نے مشہدی کے آدھے اشارے کو اپنے رشتے کا پیغام سمجھ کر ہامی بھرلی تھی اور مشہدی جاتی ہوئی فرح کو روک کر یہ بھی نہیں کہہ پایا کہ اس کا دل تو صرف فرح کے لیے دھڑکتا ہے اور یہ اشارہ فرح سے عقد کا تھا نہ کہ اُس کی ماں سے۔

مشہدی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ فرح کے جانے کے بعد بھی وہ نہ جانے کتنی دیر تک یونہی گم سم بیٹھا رہا اور پھر بارہ بجے کا گھڑیال اسے دوبارہ ہوش کی دنیا میں لے آیا۔ اُس نے فرہاد کو آواز دی اور جواب نہ پا کر اپنے گلّے کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کا ارادہ اپنی رقم کو واپس بینک میں جمع کرانے کا تھا مگر گلہ کھولتے ہی ایک دوسری قیامت اس کی منتظر تھی۔ گلہ خالی پڑا ہوا تھا اور تمام رقم غائب تھی۔ ایک لمحے میں ہی اُسے فرہاد کی غیر موجودگی کی وجہ سمجھ میں آگئی اور وہ زور سے چلاتا ہوا رپٹ درج کرانے کے لیے باہر کی جانب دوڑ گیا۔

فرہاد نے رات بھر خود کو کسی دوست کے ہاں روپوش رکھا مگر وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر اس کی یہ چوری پکڑی جائے گی لہٰذا دھوپ نکلنے کے بعد وہ چوری چھپے فرح کی گلی میں پہنچ گیا۔ اس نے چہرہ چھپانے کے لیے خود کو مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اچانک اُسے دوسری جانب سے فرح تنہا گلی میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ فرہاد سوچ میں پڑ گیا کہ یوں اچانک صبح سویرے فرح کو کہاں جانا پڑا ہوگا......؟ فرح کے گھر میں داخل ہونے کے بعد اس نے دھیرے سے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے بعد دروازہ کھلا تو ایک اجنبی نوجوان کاندھے پر فرح کے چھوٹے بھائی کو بٹھائے برآمد ہوا...... ''معاف کیجیے...... کیا فرح خانم یا ان کی والدہ گھر پر ہیں؟'' نوجوان سر ہلا کر واپس اندر چلا گیا۔ فرہاد نے جیب میں پڑی اُس رقم کو دھیرے سے تھپتھپایا جو آج وہ خاص طور پر فرح کے قدموں میں ڈالنے کے لیے مشہدی کے گلّے سے چرا کر لایا تھا۔ کچھ ہی دیر میں فرح کی ماں دروازے پر آئی اور فرہاد کو دیکھ کر خوشی سے بولی ''اوہ...... یہ تم ہو...... خوب موقعے پر آئے ہو...... آج ہمارے گھر میں بھی برسوں بعد خوشی آئی ہے...... آؤ...... اندر آجاؤ......'' فرہاد کچھ نہ سمجھتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ اندر برآمدے میں فرح اسی نوجوان کے ساتھ کھڑی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ اس کے موتیوں جیسے

دانتوں کی چمک سے فرہاد کو اپنے دل کی دنیا خیرہ ہوتی محسوس ہوئی۔فرح کی ماں بہت خوش تھی'' آؤ بیٹا آؤ...... میرے داماد سے ملو...... یہ فرح کا شوہر آغا کریم ہے...... آج ہی قید سے رہا ہو کر یہاں پہنچا ہے''......فرہاد کے اندر بیک وقت بہت سے چھناکے ہوئے۔'' آپ کا داماد؟......مگر...... آپ نے تو......؟'' ......'' ہاں......ہم ماں بیٹی نے دانستہ اس بات کا کبھی تذکرہ نہیں کیا۔لوگ جسے عموماً فرح کا چھوٹا بھائی سمجھتے ہیں......وہ فرح کا اکلوتا بیٹا ہے......دراصل سات سال سے آغا کریم کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی اور ہم بھی اپنا ملک اور گھر بار چھوڑ کر یہاں دیارِ غیر میں آ بیٹھے تھے......لہٰذا ہم نے اسی بات میں مصلحت جانی کہ فی الحال فرح کے اس رشتے کے بارے میں کسی سے بھی ذکر نہ کیا جائے۔لیکن اب خدائے بزرگوار نے آغا کریم کو صحیح سلامت واپس بھیج دیا ہے تو ہم بہت بڑی دعوت کرنے کا منصوبہ بنا بیٹھے ہیں۔تم بھی ضرور آنا اور اپنے آقائے مشہدی کو بھی ضرور اپنے ساتھ لانا......'' علی مشہدی کے نام پر خانم ذکیہ کے چہرے پر ہلکا سا گلال چھلک آیا۔فرہاد وہیں گم سم کھڑا رہ گیا۔اس کی جیب میں پڑے نوٹ اسے کاغذ کی بجائے سنپولیے محسوس ہونے لگے جو لمحہ بہ لمحہ اُسے ڈس رہے تھے۔فرہاد کو ایک زوردار چکر آیا اور وہ سر تھامے وہیں صحن میں گر گیا۔



جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے (نثری نظم)

سنو......

تمہاری وفا پہ مجھ کو

پورا یقین ہے......

پر زمانے کے وار کا

کچھ بھروسہ نہیں ہے

سو گر کبھی......

تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے

اور میری رُوح کی کومل پتیاں

تمہیں کسی ببول کی مانند چبھنے لگیں

تو مجھے یاد نہ کرنا

کہ یادوں کا زہر

زخم بھرنے نہیں دیتا
ہاں مگر دیکھو......
کبھی ان راہوں سے نفرت نہ کرنا
جن پر کبھی ہم ایک ساتھ چلے تھے
کہ راستے تو منزل کا پتہ دیتے ہیں
اور کسی کے قدموں کی بے ثباتی سے
ان راستوں کا کیا لینا دینا......؟
کبھی ان رنگوں سے نفرت نہ کرنا......
جو مجھے اچھے لگتے تھے......
کہ رنگ تو ضیا بکھیرتے ہیں......
مگر کسی کی روح کے اندھیرے سے......
ان رنگوں کا کیا لینا دینا......؟
کبھی اس دھن سے نفرت نہ کرنا
جو میری روح کے تار جوڑ دیتی تھی
کہ دھن تو سر کی ترتیب ہوتی ہے
اور کسی کے اندر کی بے ترتیبی سے
اس دھن کا کیا لینا دینا......؟
کبھی اُن نظاروں سے نفرت نہ کرنا......

جو ہم نے ایک ساتھ دیکھے تھے

کہ نظارے تو سدا خوب صورت ہوتے ہیں......

اور کسی کے اندر کی بدصورتی سے......

ان نظاروں کا کیا لینا دینا؟

کبھی ان باتوں سے نفرت نہ کرنا

جو ہم نے ایک دوسرے سے کی تھیں

کہ باتیں تو رابطہ ہوتی ہیں......

اور کسی کم نصیب کی بے ربطی سے

ان باتوں کا کیا لینا دینا......؟

بس مجھ سے

اور صرف مجھ سے نفرت کرنا

کہ میری روح کی سیاہی سے ہی

چار سو یہ اندھیرا ہے

میری بدصورتی سے ہی

ہر رنگ پھیکا ہے

ہر راہ بے راہ ہے

ہر منظر ویران ہے

ہر بات بے ربط ہے

سو......مجھ سے

اور بس مجھ سے نفرت کرنا

کہ صرف میں ہی......

تمہاری اس نفرت کے قابل ہوں

(ہاشم ندیم خان)



میرا نیا دوست (اداریہ کالم)

کاشف میرے بچپن کا دوست اور پرائمری کا ''ٹاٹ فیلو'' ہے۔ ہم دونوں کی طبیعت اور مزاجوں میں بے پناہ فرق کے باوجود بچپن سے ہم دونوں کی دوستی مثالی رہی ہے۔ شاید اس کی وجہ ہم دونوں کے اندر بسا ہوا وہ ''ٹاٹ زدہ'' انسان بھی ہے جسے ہم دونوں کبھی اپنے اندر سے نکال نہیں پائے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بچپن سے جوانی تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب ہم دونوں میں کسی نہ کسی بات پر بحث نہ ہوئی ہو اور ہم دونوں روٹھ کر اپنے اپنے راستوں پر نہ چل دیئے ہوں۔

کاشف پر بچپن سے مغربیت اور آج کل کی کہلائی جانے والی ''روشن خیالی'' کا غلبہ اس قدر طاری ہے کہ وہ اپنے اچھے بھلے نام کی جگہ امریکن لہجے میں صرف ''کیش'' کہلایا جانا پسند کرتا ہے۔ اس کے خیال میں ایم کاشف خان کچھ طبا اور کافی آؤٹ ڈیٹڈ (out-dated) قسم کا نام لگتا ہے۔

کیش اور میں بچپن میں جس سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے اس کی وردی ملیشیا (گرے) رنگ کی شلوار قمیض تھی۔ کیش کو بچپن سے ہی شلوار قمیض ''ٹائپ'' لباسوں سے شدید چڑ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شلوار قمیض میں اچھا بھلا انسان خواہ مخواہ میں ''مشکوک'' سا لگنے لگتا ہے۔ لہٰذا وہ اسکول سے واپسی پر ہی فوراً سب سے پہلے اس شلوار قمیض سے نجات حاصل کر کے اپنی پسندیدہ شرٹ اور نیکر یا پتلون زیب تن کر لیتا تھا۔ میرے پاس اس زمانے میں کوئی شرٹ یا پتلون نہیں تھی لہٰذا وہ اسکول کے بعد سارا وقت مجھے بدلباسی اور بے ذوقی کے طعنے دیتا رہتا تھا۔ گھر میں بھی ہر وقت وہ اپنے والدین سے جھگڑتا رہتا تھا کہ اُسے اس انگریزی اسکول میں داخل کروایا جائے جہاں محلے کے اعلیٰ طبقے کے بچے قمیض اور پتلون پہن کر تانگے میں بیٹھ کر اسکول جایا کرتے

تھے۔ اُسے زیادہ اعتراض اس بات پر بھی تھا کہ ان شلوار قمیض والے سرکاری اسکولوں میں صرف لڑکے ہی پڑھنے آتے ہیں اور اسے ان میلے کچیلے، سیاہی سے آلودہ ہاتھوں اور مٹی سے بھرے چہروں سے بھی سخت چڑ تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر صبح سویرے اجلے نیلے اور سفید لباسوں میں ملبوس اور سروں پر سرخ ربن سے کس کر چٹیا گوندھی ہوئی یہ پری جیسی بچیاں اگر ہمارے ٹاٹ والے اسکول میں پڑھتی ہوتیں تو ہمارے یہ اُجڈ اور جنگلی اُردو میڈیم بچے بھی ان سے کچھ نہ کچھ تہذیب سیکھ ہی لیتے۔ روز صبح جب میں اسے اسکول جانے سے پہلے لینے کے لیے اس کے گھر، گلے میں اپنا بستہ ڈالے پہنچتا تو اسے اسی بحث میں اُلجھے اور ماں باپ سے تکرار کرتے پاتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے والد بھی میرے والد کی طرح ہی ایک سفید پوش سرکاری ملازم تھے لہٰذا وہ بھی پرائیویٹ انگریزی میڈیم اسکول کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا وہ بھی اپنے لاڈلے بیٹے کو انہی طفل تسلیوں سے بہلاتے رہتے تھے۔ جن سے متوسط طبقے کا ہر باپ اپنے بچے کو بہلاتا ہے۔

کچھ ایسا ہی رویہ کیش مذہب کے بارے میں بھی رکھتا تھا۔ نماز وغیرہ سے اسے کوئی خاص ''رغبت'' نہیں تھی اور بچپن میں جب محلے کے بڑے بوڑھے ہم بچوں کو ہنکا کر مسجد کی طرف لیجاتے تھے تب کیش کسی پوشیدہ گلی میں کنچے یا ''کوکلا چھپا کی'' کھیلنے میں مصروف ہوتا۔ بڑے ہونے پر بھی اس کی زندگی سے برتاؤ ہمیشہ ایک خاص حد تک ''ماڈریٹ'' ہی رہا اور وہ ہمیشہ مذہب کو ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ کے طور پر گروانتا رہا۔

کیش ہمیشہ سے سول سروس جوائن کرنے کا خواہش مند تھا۔ اسے سفاری سوٹ پہنے اور فرنچ کٹ رکھے وہ بیوروکریٹس ہمیشہ سے مسحور کرتے تھے جو بات کرتے وقت بیچ میں رک رک کر منہ سے امپورٹڈ سگار یا پائپ کا دھواں بڑے اسٹائل سے فضا میں بکھراتے تھے۔ کیش کا بس چلتا تو وہ سرکاری دفاتر میں شلوار قمیض پہننے پر ہمیشہ کے لیے پابندی لگا دیتا۔ خاص طور پر جب وہ کسی باریش یا مولانا ٹائپ کے کسی افسر کو اپنی شلوار شرعی حد تک اونچی کیے، کوئی ڈھیلا ڈھالا کرتا یا سر پر کوئی عمامہ زیب تن کیے دفتر آتے دیکھتا تو اُس دن کیش کا موڈ بے حد خراب رہتا۔ تب میری شامت آجاتی اور وہ سارا دن میرے سر پر کھڑے بڑبڑاتا رہتا کہ ''انہی لوگوں کی وجہ سے ہم ترقی نہیں کر پا رہے۔ دفتر کو بھی مسجد بنا رکھا ہے۔ دنیا ہمارے بارے میں کیا سوچتی ہوگی؟ اگر کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا نمائندہ یا سفیر ایسے کسی دفتر میں چلا گیا تو اُن پر ہمارا کیا تاثر رہ جائے گا؟'' وہ سارا دن یونہی تلملاتا رہتا اور میں کانوں میں انگلیاں ڈالے چپ چاپ اپنے کام میں مگن ہو جاتا۔ کیش میری خاموشی سے مزید سیخ پا ہو جاتا اور چلا کر کہتا ''تم جیسوں کی اسی خاموشی نے ہی ان لوگوں کو اپنے مذہب کو ''سرکاری رویے میں بدلنے کی جرأت دی ہے۔ تم سب ہی اس رویے کی وجہ اور بنیاد بھی ہو......''

میں جانتا تھا کہ ایسے کسی بھی معاملے میں کیش سے کسی بھی قسم کی بحث بے سود ہوگی چنانچہ میں شام کو

اسے کوئی اچھی سی انگریزی فلم دکھانے لیجاتا تھا۔ کیش کا موڈ ٹھیک کرنے کی اس سے بہتر اور کوئی ترکیب نہیں ہوسکتی تھی۔ سینما ہال میں کیش اپنا پسندیدہ سگار سلگا لیتا اور نیویارک، شکاگو یا لندن کی ان گلیوں میں گھومنے کے سپنے دیکھنے لگتا جو اس وقت سینما اسکرین پر دکھائی جارہی ہوتیں۔

پھر 9/11 کی قیامت آئی اور دنیا خودکش حملوں کی اک نئی جنگ میں مبتلا ہوگئی۔ ایسے میں بھی کیش کو مسلمانوں کے عمومی رویے اور دنیا کو دی جانے والی خودکش دھمکیوں سے شدید الجھن اور چڑ پیدا ہونے لگی تھی۔ وہ سارا دن میرا دماغ چاٹتا رہتا۔ ''تو یہ ہے وہ مذہب...... جس کا پرچار کرتے تمہارے نام نہاد علماء کی زبانیں نہیں تھکتیں......؟ ...... جینا مشکل کر رکھا ہے مجھ جیسوں کا تمہاری اس جماعت نے۔ میں پوچھتا ہوں آخر ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے......؟''

پھر لال مسجد کا قصہ شروع ہوا۔ کیش سارا دن ٹی وی کے سامنے بیٹھا غازی برادران اور ان کے رویے کو کھری کھوٹی سناتا رہتا۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی اس کے اندر کا غصہ ابل پڑتا۔

''خوب جگ ہنسائی کروا رہے ہیں تمہارے یہ غازی برادران۔ میرے غیر ملکی دوست مجھے دنیا بھر سے فون کرکے پوچھتے ہیں کہ یہ تمہارا کیسا اسلام ہے جسے پھیلانے کے لیے پردہ پوش خواتین کو باقاعدہ ڈنڈے لیکر سڑکوں پر نکلنا پڑتا ہے۔ اب تم ہی کہو...... میں انہیں کیا جواب دوں......؟''

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا معاملہ لحہ بہ لحہ اپنے منطقی انجام تک پہنچنا شروع ہوگیا اور کیش کی بڑبڑاہٹ بھی بتدریج بڑھتی گئی۔ کبھی وہ براہ راست مجھے انتہا پسند ہونے کے طعنے دیتا اور کبھی عورتوں اور بچوں کو ڈھال بنانے والے ''دہشت گردوں'' کا ساتھی کہتا کیونکہ روز اول سے وہ مجھ جیسوں کی خاموشی کو نیم رضا مندی کا الزام دیتا آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جس دن پاکستان کی یہ خاموش اکثریت بول پڑے گی وہی دن انقلاب کا دن ہوگا۔ پھر وہ رات آئی جب تمام کاغذی معاہدوں، محفوظ راستہ دینے کے دعوؤں اور معصوم بچوں اور عورتوں کی حفاظت کو اولیت دینے کے وعدوں کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ بھورے رنگ کے بارود کی بو میں سرخ رنگ کے لہو کی مہک رچ بس گئی۔ چند گھنٹے تک چیخوں، آہوں اور سسکیوں کا غلبہ رہا اور پھر چاروں طرف موت کی خاموشی چھا گئی۔ اس دن میں بوجھل دل کے ساتھ صبح سویرے کیش کے گھر جا پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ آج اس کے اندر کا ترقی پسند اور روشن خیال انسان بے حد خوش ہوگا۔ آج وہ اپنے پسندیدہ سگار کے لمبے اور بھرپور کش لیتے ہوئے اپنے دالان میں آرام کرسی پر بیٹھا چہرے پر اپنی مخصوص مسکراہٹ سجائے میرا استقبال کرے گا اور چٹکی بجا کر کہے گا

''دیکھا...... میں نہ کہتا تھا، انتہا پسندی کا انجام یہی ہونا تھا۔ میرا بس چلے تو میں تمام انتہا پسندوں کو ایک ساتھ ختم کردوں۔ لیکن یہ کیا؟ کیش کے چہرے پر تو جیسے برسوں کی زردی سی پھیلی ہوئی تھی۔ سگار اس کے

ہاتھ میں سلگتے سلگتے بجھ گیا تھا اور راکھ سے کیش کا قیمتی قالین اٹ گیا تھا۔ وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ میں اپنی حیرت چھپا نہ سکا۔

''میرا تو خیال تھا کہ آج تم کسی بھرپور جشن کی تیاری میں مصروف ہو گے۔ تمہاری خواہش کے مطابق انتہا پسندوں اور انتہا پسندی سے پوری طاقت کے ساتھ نپٹا گیا ہے۔ تو بتاؤ...... آج اس خوشی میں کہاں چلنے کا ارادہ ہے۔''

کیش نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور سرسراتی سی آواز میں بولا ''کیا تم جانتے تھے کہ ان لوگوں نے اندر سات دن سے کچھ نہیں کھایا تھا اور حکومتی ترجمان آخری وقت میں ان سے تین سو افراد کے کھانے کے انتظام کا وعدہ کر گئے تھے۔''

میں نے حیرت سے کیش کو دیکھا ''ہاں...... میں جانتا ہوں، لیکن اس بات سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے کہ انہیں کھانا کھلا کر مارا جاتا یا پھر بھوکے پیٹ ہی ختم کر دیا جاتا، تمہارا مقصد تو بہر حال حل ہو گیا نا۔''

کیش اب بھی گم سم تھا۔ وہ پھر اسی لہجے میں بولا۔

''کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ مدرسے کے صحن میں کوئی بارودی سرنگ کوئی تہ خانہ وغیرہ نہیں تھا اور باہر آنے والی طالبات میں سے کسی نے یہ بیان نہیں دیا کہ انہیں اندر کسی طور پر بھی یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا بلکہ وہ سب خود اندر رہنے پر بضد تھیں۔''

مجھے حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ یہ آج کیش کو کیا ہو گیا ہے۔ میں نے جھلا کر جواب دیا ''ہاں ہاں میں جانتا ہوں لیکن تم نے شاید ہمارے وزیر صاحب کا بیان نہیں پڑھا کہ ان معصوم طالبات کو خود اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ انہیں اندر ''یرغمال'' بنا کر رکھا گیا ہے۔ یہ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ تمہارے منہ سے یہ سوال کچھ اچھے نہیں لگ رہے مجھے اور پھر تم ان کلاشنکوف برداروں کو کیوں بھول رہے ہو جو بقول تمہارے پوری دنیا میں ٹی وی کے ذریعے ہمارے ملک اور مذہب کی بدنامی کا باعث بن رہے تھے۔ آخر ان سے نپٹنے کے لیے حکومت کو کوئی نہ کوئی ایکشن تو لینا ہی تھا نا۔'' آج لگتا تھا کہ میں کیش کی جگہ لے کر خود اسے تسلیاں دینے کے لیے یہاں آیا تھا۔ کیش بے چینی سے کھڑا ہو گیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے میں خود کو اپنی توجیہات سے بہلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن جانے کیوں ایسی ہر توجیہہ کے جواب میں میرے ذہن کے گوشوں میں ان برقعہ پوش اور عفت مآب طالبات اور معصوم بچوں کی بے یار و مددگار پڑی لاشیں ابھر آتی ہیں جنہیں شاید آخری وقت تک یہ یقین تھا کہ ان کے اپنے ان پر گولی نہیں چلائیں گے۔ چند لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کی سزا ان معصوم عورتوں اور بچوں کو نہیں ملنی چاہیے تھی۔ جانے آج مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ غازی رشید کو محفوظ راستہ دے دینا

چاہیے تھا۔ اگر وہ غلطی پر تھا تو اس سے اور اس کے محافظوں سے بعد میں قانون کے ذریعے نپٹا جا سکتا تھا ایک بے گناہ کی لاش گرانے سے کہیں بہتر تھا کہ سو گناہ گاروں کو (اگر وہ گناہ گار تھے) جانے دیا جاتا۔''

کیش کی آنکھیں زندگی میں شاید پہلی مرتبہ میں نے بھیگتی دیکھی تھیں۔ وہ دھیرے سے بولا ''آج جانے کیوں میرا دل غازی رشید اور ان طالبات اور بچوں کے لیے رو رہا ہے۔

کیش چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے اندر چلا گیا۔ میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن اپنے اس نئے دوست کو دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ وہی کیش ہے جو ساری زندگی غازی رشید جیسے لوگوں سے الرجک رہا ہے؟ سچ ہے......ہم مسلمان اپنے اوپر چاہے کتنے ہی ''کیش'' نما لبادے اوڑھ لیں لیکن ہمارے اندر کا محمد کاشف خان ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ ہاں ...... یہ میرا نیا دوست ہے جسے ایک رات نے کیش سے دوبارہ کاشف بنا دیا۔ جانے اس رات اور کتنے ''کیشوں'' کا جھوٹا بھرم ٹوٹا ہوگا۔ جانے ہم سب کے کتنے نئے دوستوں نے جنم لیا ہوگا؟؟؟؟



رانگ نمبر (افسانہ)

(Wrong Number)

لڑکے کے موبائل فون پر ایک انجانا نمبر جگمگایا "ھیلو" دوسری جانب کوئی لڑکی تھی۔ "آپ کون.....؟" لڑکے نے چڑ کر کہا "فون آپ نے ملایا ہے.....اپنا تعارف کروائیں....." لڑکی نے جلدی سے نمبر کاٹ دیا "سوری.....رانگ نمبر....." لڑکے نے حیرت سے اپنے سیل فون کی جانب دیکھا "کمال ہے.....خود ہی کال کی اور خود ہی رانگ نمبر کہہ کر کاٹ دیا..... حیرت ہے....." اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر یہی بات اس نسوانی آواز والے نمبر پر مختصر پیغام کی صورت میں لکھ کر بھیج دی..... کچھ دیر تک جواب نہیں آیا تو وہ بھی بھول بھال کر اپنی مصروفیت میں کھو گیا۔ رات کو سونے سے قبل اس نے فون بند کرنے سے پہلے یونہی ایک سرسری نظر ڈالی تو ایک پیغام کا نشان سکرین پر واضح تھا۔ اس نے پیغام کھولا "معاف کیجئے..... میں اپنی سہیلی کا نمبر ملا رہی تھی..... جانے آپ کے نمبر سے کیسے مل گیا..... بہر حال..... ایک بار پھر معذرت" لڑکے نے فراخ دلی سے جوابی پیغام لکھ ڈالا "جائیں معاف کیا....." دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ لڑکے نے فون بند کر دیا اور سو گیا۔

صبح اٹھ کر حسب عادت اس نے رات کے پیغامات پڑھنے کے لیے سیل آن کیا۔ رات گئے کسی وقت لڑکی نے جواب دیا تھا "آپ کی معافی کی ضرورت نہیں.....زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کریں تو بہتر ہوگا....." لڑکے کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ آ گئی اور اس نے پیغام لکھا "کتنا فری ہوا جا سکتا ہے.....؟؟؟"

جواب بھیج کر وہ یونیورسٹی جانے کی تیاری میں مصروف ہوگیا اور شام تک دوسری جانب سے خاموشی چھائی رہی۔ شام کو لڑکے نے کوئی جواب نہ پاکر ایک اور وار کیا۔ ''خاموشی نیم رضامندی ہے؟'' دوسری جانب سے جلا کٹا پیغام آیا ''اپنی حد میں رہیں......'' لڑکے نے پھر شرارت کی ''میری حد بتائیں......؟'' لڑکی نے ڈانٹا ''میں نے حد بتائی تو حد بھول جاؤ گے......'' لڑکا مستقل مزاج تھا۔ ''چلو آپ سے تم پر تو آئیں......ویسے یہ اچھا طریقہ ہے مجھ جیسے ہینڈسم لڑکے سے رابطے بڑھانے کا...... پہلے خود ہی کسی طرح میرا نمبر معلوم کر کے ایک گمنام فون کیا اور پھر بہانہ بنا دیا کہ سہیلی کو فون کر رہی تھی۔ ذرا مجھے بھی تو اپنی اس سہیلی کا نمبر بھیجیں جو میرے نمبر کے اتنے قریب تر ہے کہ آپ غلطی سے میرا نمبر ملا بیٹھیں......؟'' دوسری جانب سے کرارا جواب آیا ''یہ منہ اور مسور کی دال...... میری سہیلی آوارہ گرد لفنگوں سے بات نہیں کرتی'' ...... ''اوہ......تو گویا میرے کردار کے بارے میں بھی کافی معلومات اکٹھی کر رکھی ہیں۔ شاید تم جلتی ہو کہ کہیں تمہاری سہیلی کی مجھ سے دوستی نہ ہو جائے...... یا پھر ایسی کسی سہیلی کا کوئی وجود ہی نہیں......'' لڑکی زچ ہوگئی ''آخر تم چاہتے کیا ہو؟......'' لڑکے نے لطف لیتے ہوئے پیغام لکھا ''کچھ نہیں......بس اتنا کہ غلط کال کرنے کا جرمانہ بھرا جائے......'' جواب آیا ''جرمانہ بتاؤ......؟'' ...... ''ہر صبح مجھے صبح بخیر کہنا ہوگا اور رات کو شب بخیر......ٹھیک سات دن تک......'' دوسری جانب سے احتجاج بلند ہوا ''نہیں ......صرف تین دن......'' لڑکا مان گیا ''اوکے......'' پھر اس رات لڑکی کا پیغام آیا ''پہلا شب بخیر......'' لڑکا مسکرا کر سو گیا۔ صبح پیغام ملا ''پہلی صبح بخیر......'' اور پھر یہ نوک جھونک تین دن تک چلتی رہی۔ تیسری رات لڑکی کا آخری پیغام آیا ''آج تین پورے ہوگئے ہیں۔ میں نے تمہاری سزا کی تعمیل کر دی ہے......امید ہے اب مجھے تنگ نہیں کرو گے۔'' لڑکے نے منہ مسکرا کر جوابی پیغام لکھا ''ٹھیک ہے...... امید ہے تم بھی آئندہ دیکھ بھال کر کسی کا نمبر ملاؤ گی...... ویسے تمہارا نام کیا ہے......؟'' کچھ وقفے کے بعد لڑکی کا جواب آیا۔ ''کیا یہ بتانا ضروری ہے......؟'' لڑکے نے لکھا ''نہیں......بس ایک تجسس سا تھا۔ بہرحال اپنا خیال رکھو...... خدا حافظ......'' لڑکی کا جواب آیا ''شب بخیر...... خدا حافظ......'' اگلی صبح لڑکے نے یونہی بے خیالی میں نیند سے جاگتے ہی پیغاموں کی فہرست جانچی۔ وہاں لڑکی کا پیغام نہیں تھا۔ لڑکا اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ ایک دن گزر گیا اور پھر یونہی دوسرا اور تیسرا دن بھی بیت گیا۔ لڑکا اس رانگ نمبر اور ان پیغامات کو بھولنے لگا تھا کہ اچانک چوتھے روز صبح فون کھولنے پر وہی پیغام ان باکس میں ملا ''صبح بخیر'' لڑکے نے پوچھا ''سزا تو پوری ہو چکی تھی، پھر یہ صبح بخیر کیسی......؟'' دوسری جانب سے لڑکی کا پیغام آیا ''یہ بونس ہے۔'' لڑکا ہنس پڑا ''واہ...... کیا بات ہے...... سزا میں بھی بونس...... پہلی بار سنا ہے......'' جواب آیا ''کیسے ہو......؟ ......میرے پیغامات کا انتظار تو رہتا ہوگا؟'' ......لڑکے نے جواب دیا ''پیغام ملنے سے زیادہ پیغام بھیجنے والے کا زیادہ اشتیاق معلوم ہوتا ہے۔'' ...... لڑکی نے جواب دیا ''بس یونہی......سوچا تم سے پیغام پر بات کر

لوں...... عجیب سی عادت پڑ گئی تھی ان تین دنوں میں...... مگر تم کہو تو آئندہ پیغام نہیں بھیجوں گی......'' لڑکے نے شرارت کی ''ہمیں کیا خبر تھی کہ کچے دھاگے سے بندھے آئیں گے سرکار مرے......'' لڑکی نے جل کر جواب دیا ''خوش فہمی ہے تمہاری...... ٹھیک ہے...... اب پیغام نہیں بھیجوں گی......'' لڑکے نے سوال دھرایا ''اچھا اپنا نام تو بتاتی جاؤ مس گم نام......'' لڑکی نے کچھ وقفے کے بعد صرف ایک نام بھیجا ''آسیہ'' اور پھر دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ لڑکے نے رات کو پیغام بھیجا ''میرا نام نہیں پوچھو گی آسیہ......'' لڑکی کا جواب آیا ''حرکتوں سے تو تم کوئی خیر بخش یا الف دین نما کوئی شخصیت لگتے ہو......'' لڑکا ہنس پڑا ''میں بھی تمہیں رحمت بی بی یا خیر النساء ٹائپ کی کوئی چیز سمجھتا ہوں......'' ......''الف دین......'' ......''خیر النساء'' دونوں نے ایک دوسرے کے نام ازبر کر لیے۔ صبح پھر لڑکی کا پیغام آیا ''صبح بخیر الف دین......'' لڑکے نے جواب دیا ''جیتی رہو خیر النساء......'' اور پھر ان پیغامات کا سلسلہ چل پڑا۔ مگر اب پہلے پیغام بھیجنے والی لڑکی ہوتی اور دیر سے جواب دینے والا لڑکا۔ الف دین نے ایک آدھ مرتبہ خیر النساء سے ملاقات کا کہا مگر خیر النساء کچھ محتاط تھی۔ نتیجہ الف دین کی دلچسپی خیر النساء کے پیغامات میں کم ہونے لگی۔ اب لڑکی لڑکے کو چھیڑنے کے لیے پیغام بھیجتی اور لڑکے کی جانب سے گھنٹوں بعد یا پھر اگلے دن ایک مختصر سا جواب آتا۔ مرد اور عورت کی ازلی خصلت رنگ دکھانے لگی۔ لڑکا اس آنکھ مچولی سے بے زار اور لڑکی چھپ کر اظہار کرنے کی حد تک آ پہنچی۔ لڑکی کا پیغام آیا ''کیا بات ہے...... آج کل کچھ اُکتائے سے رہتے ہو......'' لڑکے نے جوابی پیغام بھیجا ''تم سامنے نہیں آتی ہو...... اور مجھے زیادہ تجسس پسند نہیں......'' لڑکی کا پیغام آیا ''پہلے کسی اعتبار کا بھرم تو قائم ہو جانے دو...... اور پھر کیا ضروری ہے کہ ہماری ملاقات بھی ہو...... ہم یوں بھی تو اچھے دوست بن سکتے ہیں......'' لڑکے نے جواب لکھا ''میں اجنبیوں سے دوستی نہیں کرتا...... اور ہم دونوں ابھی تک ایک دوسرے کے لیے صرف ایک رانگ نمبر ہیں...... میں اس رانگ نمبر کو ایک شناخت اور ایک رشتے کی پہچان دینا چاہتا ہوں۔'' لڑکی نے لاکھوں بار کا دہرایا ہوا جملہ لکھا ''میری کچھ مجبوریاں ہیں...... پہلے ہم ایک دوسرے کو ٹھیک سے سمجھ تو جائیں...... پھر ملاقات بھی ہو جائے گی......'' لڑکے نے بے زار ہو کر لکھا ''کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک......'' اگلے روز لڑکی نے ایک مختصر پیغام بھیجا ''کیا ہم صرف اچھے دوست نہیں بن سکتے......؟'' لڑکے نے مختصر ترین جواب لکھا ''نہیں......'' دو تین روز کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ انہی دنوں لڑکے کی کسی اور لڑکی سے ملاقات ہوئی اور فون نمبرز کے تبادلے کے بعد دونوں نے پیغامات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لڑکے کا پہلا پیغام تھا ''اس پہلی ملاقات کی شناخت اور دوستی کے رشتے کے لیے ہماری اگلی ملاقات ضروری ہے......'' لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا ''میں سوچوں گی......'' اسی ادھیڑ بن میں تین روز گزر گئے۔ نئی لڑکی اور لڑکے کے پیغامات کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ آخر لڑکی نے ملنے کی ہامی بھر لی ''ٹھیک ہے...... لیکن میں اپنی سہیلی کے ساتھ آؤں گی...... اور ہم صرف پندرہ بیس منٹ

کے لیے ہی مل پائیں گے......'' لڑکے نے خوش ہو کر جوابی پیغام بھیجا'' مجھے منظور ہے......جگہ اور وقت بھی تم ہی چن لو......'' لڑکا بے تابی سے نئی لڑکی کے جواب کا انتظار کرنے لگا اچانک اس کے فون پر نئے پیغام کا نشان جگمگایا۔لڑکے نے بے تابی سے پیغام کو کھولا لیکن وہ پرانی والی خیر النساء تھی'' ہیلو......کیسے ہو......؟'' لڑکے نے بے دلی سے پیغام مٹا دیا لیکن کچھ دیر بعد دوبارہ اُسی آسیہ عرف خیر النساء کا پیغام آیا'' کیا بات ہے......؟ ابھی تک ناراض ہو گیا......؟'' لڑکے نے کچھ دیر سوچا اور اپنا آخری پیغام لکھ کر بھیج دیا

پرانی لڑکی (آسیہ) نے بے تابی سے پیغام کھولا وہاں صرف دو لفظ جگمگا رہے تھے'' سوری......رانگ نمبر......''



رین کوٹ (افسانہ)

(Rain Coat)

تیز برستی بارش میں جب کسی کی نئے ماڈل کی گاڑی ہچکولے لیتی ہوئی ایک جھٹکے سے رُک جائے تو اس کوفت کا اندازہ صرف وہی لگا سکتا ہے جو اس گاڑی میں سوار ہو۔ نعمان کو بھی اسی اچانک افتاد کا ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔ آج صبح وہ اپنی فیکٹری کے لیے نئی سائٹ دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تو ہلکی پھوار اسی وقت شروع ہو چکی تھی۔ مگر جلد ہی وہ بوندا باندی تیز برسات میں تبدیل ہو گئی اور شہر کے آخری بس اسٹاپ سے کچھ فاصلے پر گاڑی نے چند ہچکیاں لیں اور رُک گئی ''کیا ہوا......؟'' ڈرائیور نے پریشانی کے عالم میں بونٹ بند کیا۔ ''صاحب جی کچھ سمجھ نہیں آ رہا...... یہ آٹو میٹک نئی گاڑیاں اپنی سمجھ سے باہر ہیں...... کسی مکینک کو بلوانا پڑے گا جناب......'' نعمان نے بے زاری سے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے تم کسی مکینک کو بلا لاؤ...... میں سامنے والے بس اسٹاپ کے شیڈ کے نیچے تمہارا انتظار کرتا ہوں...... بند گاڑی میں یوں سرِ راہ بیٹھے رہنا مجھے بہت عجیب لگتا ہے۔'' نعمان نے گاڑی سے نکلنے سے پہلے رین کوٹ پہن لیا تا کہ اس کا قیمتی سوٹ خراب ہونے سے بچ جائے اور پھر تیزی سے قدم اٹھاتا، خود کو بارش سے بچاتا، وہ سامنے نظر آتے بس اسٹاپ کی جانب بڑھ گیا۔ سڑک کے دونوں اطراف آنے اور جانے والوں بسوں کے لیے ٹین کے چھپر نما اسٹاپ بنائے گئے تھے۔ جس کی ٹین کی ہٹ نما چھت کے نیچے لکڑی کے بینچ پڑے ہوئے تھے۔ دونوں جانب کچھ مسافر بیٹھے اور کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے۔ نعمان نے برساتی کے بٹن بند کرتے ہوئے سرسری نظر سڑک کی دوسری جانب بنے دوسرے اسٹاپ پر ڈالی اور پھر اس کی نظریں جیسے جم کر رہ گئیں۔ اس نے دو تین بار پلکیں جھپک کر اپنے گماں کو یقین کی حد تک

پہنچانے کی کوشش کی۔ مگر وہ سراب نہیں...... حقیقت تھی...... ہاں...... وہی تو تھی...... کاجل...... اس کے بالکل مخالف سمت والے اسٹاپ کے نیچے کھڑی، بارش سے بھیگی سی...... ہمیشہ کی طرح خود کو پہلے بے تحاشہ بھگو کر پھر کانپتے رہنے والی کاجل......'' نعمان بے اختیار اس کی جانب بڑھنے کے لیے سڑک پر دو قدم چلا تو کسی گاڑی کے تیز ہارن نے اسے چونک کر واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ ہارن کی آواز سن کر کاجل نے بھی چونک کر اوپر دیکھا اور اس کی نظر نعمان سے ٹکرائی تو وہ بھی ہکا بکا سی رہ گئی۔ اب جانے وہ بارش کی بوندیں تھیں یا پھر اس کے آنسو جو اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے اس کے گلابی عارض کے موتی بن گئے۔ دفعتہً نعمان کو احساس ہوا کہ کاجل کے ساتھ کوئی اور مرد بھی تھا۔ پرانی جینز اور ایک پتلی سی شرٹ میں ملبوس...... بار بار ہاتھوں کو رگڑ کر گرمانے کی کوشش میں مصروف...... اس نے ایک آدھ بار کاجل سے کوئی بات بھی کی اور کاجل نے سر جھکا کر اُسے زیر لب جواب دیا۔ شاید وہ کاجل کا شوہر ہوگا؟ نعمان اسی شش و پنج میں گرفتار کھڑا رہا۔ نعمان کے جانب آنے والی بس آ گئی اور مسافر جلدی میں ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے بس میں سوار ہو کر اپنی منزل کو روانہ ہو گئے اور نعمان وہاں تنہا کھڑا رہ گیا۔ بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔

یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی باہر کچھ زیادہ بھگو نہ بھی پائیں پھر بھی ہمارے اندر جل تھل مچا دیتی ہیں یہ اور بات ہے کہ ہمارے اندر برستی وہ پھوار باہر کسی کو نظر نہیں آتی۔ لیکن کچھ بدنصیب ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کے اندر باہر برستے ساون کا ایک چھینٹا بھی نہیں پڑتا۔ ان کا اندر سدا صحرا ہی رہتا ہے۔

آج صبح نعمان نے جب گھر سے نکلتے ہوئے کھونٹی سے اپنے مخصوص نیلے رنگ کا رین کوٹ اتارا تو ایک لمحے کے لیے جیسے اس کا سارا ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے برق کی طرح گزر گیا تھا وہ بھی ایک ایسی ہی طوفانی بارش کا دن تھا جب پہلی مرتبہ اس کی ملاقات کاجل سے ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھنے کے باوجود شعبے علیحدہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے انجان تھے۔ لیکن اس روز کی شدید برسات نے ان دونوں کو ملوا دیا۔ وہ دونوں ہی کالج بس نکل جانے کے بعد ڈیپارٹمنٹ کے برآمدے میں بارش رکنے کے انتظار میں کھڑے تھے لیکن کچھ بارشیں کبھی نہیں تھمتیں۔ بادل برس کر چلے جاتے ہیں مگر من کی پھوار کبھی نہیں رکتی۔ ان دونوں کے لیے بھی بارش کچھ ایسا ہی پیغام لے کر آئی تھی۔ ساون میں شامیں بہت جلد ڈھل جاتی ہیں۔ کاجل بھی تیزی سے ہوتی شام اور مزید کالی گھٹاؤں کی آمد سے پریشان کھڑی اپنی نازک کلائی پر بندھی گھڑی کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ نعمان بھی ایک جانب کھڑا خود کو کوس رہا تھا کہ اس نے آج اپنی بائیک لانے میں سستی کیوں کی؟ آخر جب بارش نے تھمنے کا نام نہیں لیا اور اندھیرا بڑھنے لگا تو گھبرائی سی کاجل نے کچھ فاصلے پر کھڑے نعمان کو پکارا ''سنیں...... پلیز آپ کیمپس کے باہر سے کوئی رکشہ پکڑ لائیں گے میرے لیے...... بہت دیر ہو گئی ہے...... گھر میں امی پریشان ہو رہی ہوں گی......'' نعمان خود بھی یہ سوچ رہا تھا کہ اب یہاں کھڑے

رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے لہٰذا مین گیٹ سے باہر جا کر کوئی سواری پکڑ لینی چاہیے کچھ ہی دیر میں بھیگا بھاگا سا نعمان ایک رکشے کے ساتھ کیمپس میں داخل ہوا۔ کاجل کو ڈیفنس کی طرف جانا تھا اور نعمان کو صدر...... دونوں کی سمت مخالف تھی لیکن موسم کے تیور بتا رہے تھے کہ کچھ دیر بعد جب شام ڈھل جائے گی تب شاید واپسی کے لیے سڑک پر کوئی سواری بھی نہ ملے۔ ویسے بھی یونیورسٹی شہر سے دور مضافات میں واقع تھی۔ آخر کار طے یہ پایا کہ پہلے کاجل کو اُس کے گھر اتارا جائے اور پھر یہی رکشہ نعمان کو اُس کی منزل تک پہنچائے گا۔ راستے میں کاجل رکشے کے اندر سکڑی سمٹی سی بیٹھی رہی مگر یہ رکشہ بھی بڑی بدتمیز قسم کی سواری ہے ایک ذرا سا کنکر بھی پہیے کے نیچے آ جائے تو پورا ''کانپ'' جاتا ہے۔ لہٰذا نعمان اور کاجل کو جمے رہنے کے لیے سامنے لگی لوہے کی راڈ کو نہایت مضبوطی سے تھام کر بیٹھنا پڑا۔ لیکن جھٹکے تھے کہ رُکنے میں ہی نہیں آ رہے تھے اور پھر جب بے خیالی میں ان دونوں کی ایک دوسرے پر نظر پڑی تو اپنی اپنی حالت دیکھ کر وہ دونوں ہی بے ساختہ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ یہ ان کی دوستی کی ابتداء تھی۔ اور پھر کوئی دن ایسا نہ گزرا کہ ان کی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ وہ گھنٹوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو کھو جا کرتے اور بالآخر ان کی یہ کھوج محبت کے اس گم نام جزیرے پر جا کر ختم ہوئی جہاں داخل ہونے کے لیے تو ہزار راستے موجود ہیں مگر نکلنے کا ایک بھی دروازہ نہیں ہوتا۔ تب ایک دن ایسی ہی بھیگتی شام میں کاجل نے نعمان کو یہ رین کوٹ تحفے میں دیا تھا۔ ان کے شہر میں بارشیں بہت برستی تھیں لیکن کاجل کا یہ تحفہ اُس بھیگی شام کی یاد میں تھا جب اُن دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ویسے بھی کاجل کو رین کوٹ پہنے مرد بہت سوبر لگتے تھے۔ اسے نعمان کو یہ نیلا رین کوٹ پہنے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن ان کے نصیب کا وہ آخری ساون ثابت ہوا۔ اگلے برس ہی اُن کی محبت کے چاند کو گرہن لگ گیا۔ کاجل کے بھائی نے اُسے کہیں باہر نعمان کے ساتھ یونیورسٹی اوقات میں گھومتے پھرتے دیکھ لیا اور کاجل کی تعلیم کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا۔ نعمان نے اپنے طور پر ہر کوشش کر دیکھی مگر کاجل کی نظر بندی ختم نہ ہو سکی۔ گھر والوں نے کاجل کی سہیلیوں کو بھی زیرِ لب کاجل کے پہرے میں دخل نہ دینے کا پیغام دے دیا تھا۔ ایسے میں کاجل کی ہم جماعت نائلہ جو اس کی ہمسائی بھی تھی نعمان کا آخری سہارا ثابت ہوئی اور اُس نے کسی طور کاجل تک نعمان کا یہ پیغام پہنچایا کہ اگر وہ دونوں نہ مل پائے تو نعمان مر جائے گا۔ مگر محبت کا زہر کسی کو پوری موت بھی کب مرنے دیتا ہے؟ سو نعمان بھی زندہ رہا مگر بہت سالوں تک مردوں سے بدتر زندگی گزارتا رہا۔ کاجل کے گھر والوں نے جلدی میں اُس کی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی رسم ادا کر کے اپنی جان چھڑائی۔ کاجل نے نائلہ کے ذریعے ہی نعمان کو یہ آخری پیغام بھجوایا کہ وہ اپنے گھر کی ہونے جا رہی ہے۔ لہٰذا اب نعمان بھی اُس کا خیال اپنے دل سے نکال کر گھر بسا لے...... نعمان یہ سن کر اندر سے ہزار بار کٹ کر رہ گیا۔ یہ لڑکیاں اپنا گھر بستے ہی کس آسانی سے دوسروں کو گھر بستی کے مشورے دینا شروع کر دیتی ہیں۔ نائلہ کے بقول کاجل کا رشتہ بہت اچھے اور امیر

کبیر خاندان میں ہوا تھا اور اس کا شوہر کاجل کا بہت خیال رکھتا تھا۔

کاجل کی شادی کے بعد نعمان کا بھی اس شہر میں دل نہ لگا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کسی دوست کی وساطت سے امریکہ چلا گیا۔ وہاں اُس کے دل کے زخم تو نہ بھرے پر اُس کی جیب بھرتی چلی گئی۔ اُسے نیا کاروبار راس آ گیا اور پانچ سال میں ہی نعمان خود اپنے گھر اور فیکٹری کا مالک بن گیا۔ لیکن اب اس کا دل اس پردیس سے بھی اُچاٹ ہونے لگا تھا۔ اُسے اپنا شہر اپنے دوست اور گھر والے یاد آنے لگے تھے۔ لہٰذا اس نے تین ماہ کی چھٹی لی اور اپنے ملک چلا آیا۔ اس کا شہر اب بھی ویسا ہی تھا۔ بارش کے بعد اب بھی ویسی ہی سوندھی مٹی کی خوشبو آتی تھی در و دیوار سے..... نعمان شہر سے باہر کوئی بڑی خالی جگہ دیکھ کر اپنی فیکٹری یہاں لگانا چاہتا تھا اور آج اسی سلسلے میں وہ اپنے ڈرائیور کو لے کر سائٹ ایریا کی طرف نکلا تھا کہ راستے میں گاڑی خراب ہو جانے کی وجہ سے آج وہ پھر دل کے اُس حادثے سے دوچار ہو گیا تھا جسے سنگین کہا جا سکتا تھا اور نہ حسین..... کاجل کی حالت بھی صاف بتا رہی تھی کہ وہ یوں اچانک نعمان کو اپنے سامنے پا کر کس قدر شدید اندرونی کشمکش کا شکار ہے۔ آخر کار نعمان نے ہی سڑک پار کر کے کاجل کی جانب قدم بڑھائے۔ دوسری جانب کے بس اسٹاپ پر بھی بس چند لوگ ہی بچے تھے اور ان میں سے کئی اس آخری آنے والی پرانی سی ویگن میں سوار ہو کر جا چکے تھے۔ نعمان کو یہی فکر تھی کہ کسی بھی لمحے کاجل کی بس بھی آتی ہی ہو گی اور وہ اس سے بات کیے بنا چلی گئی تو یہ کسک اس کے دل میں ہمیشہ کسی کانٹے کی طرح چبھتی رہے گی۔ مگر جب وہ تیز برستی بوندوں سے خود کو بچاتا ہوا سڑک کی دوسری جانب پہنچا تو کاجل کچھ گھبرا سی گئی۔ نعمان کو اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے ایک ایسی التجا آمیز مجبوری کی پرچھائی نظر آئی جیسے وہ نعمان سے کہنا چاہ رہی ہو کہ ''خدا کے لیے میرے شوہر کے سامنے مجھے نہ پکارنا ....'' نعمان کے ہونٹ کھلنے سے پہلے ہی سل گئے۔ بارش کا رخ بدل چکا تھا اور اب تیز بوچھاڑ کی پھوار اُن سب کو بھگونے لگی تھی۔ اچانک کاجل کا شوہر غصے میں دھیرے سے بڑبڑایا۔ نعمان کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ کاجل کو ڈانٹ رہا تھا ''میں نے کہا بھی تھا کہ ذرا جلدی نکل پڑو گھر سے..... لیکن تم میری سنتی ہی کب ہو..... چھوٹ گئی ناں پہلی بس ..... اب کھڑی بھیگتی رہو ..... اپنے ساتھ مجھے بھی خوار کر دیا..... لعنت ہے ایسی زندگی پر.....'' نعمان کے دل پر جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا ہو۔ نائلہ تو کہہ رہی تھی کہ کاجل کا شوہر اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ تو پھر یہ سب کیا ہے؟ کاجل سر جھکائے اپنے شوہر کی صلواتیں سنتی رہی۔ جانے اس کے ماتھے پر چمکتے قطرے بارش کے تھے یا شرمندگی کے پسینے کے.....؟ ..... وہ پھولوں سی کومل لڑکی جس کی جبیں پر بل آتے ہی نعمان تڑپ اُٹھتا تھا اور جس کی راہوں کی دھول وہ اپنی پلکوں سے صاف کیا کرتا تھا آج وہ خود کسی کے تلخ اور تند و تیز لہجے کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ رہی تھی۔ کاجل کا شوہر اُسے سخت سست سنانے کے بعد قریب کھڑے خوانچے والے سے کسی سستے برانڈ کا سگریٹ خریدنے لگا۔ کاجل نے ایک

لمحے کے لیے نظر اُٹھا کر نعمان کی طرف دیکھا اور اس ایک نظر میں ہی اُس نے سب کہہ دیا۔ اپنی بے بسی، مجبوری، تڑپ اور اپنے درد کا ہر فسانہ بیان کر دیا۔ نعمان جس کے دل کو آج تک ہی سوچ کر ذرا سا قرار ملا تھا کہ کاجل اپنی دنیا میں خوش اور مگن ہے ایک بار پھر غم اور کسک کے اُسی پرانے سمندر میں اُتر گیا جس کے بھنور نے بڑی مشکل سے اُس کا پیچھا چھوڑا تھا۔ کاجل کا شوہر بارش میں بری طرح بھیگ چکا تھا اور سرد ہوا سے اس کا بدن دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ نعمان نے کاجل کے لباس کو غور سے دیکھا تو وہ بھی ایک سستے سے جوڑے میں ملبوس تھی۔ اُس نے دھیرے سے اپنے شوہر سے کہا ''آپ بھیگ گئے ہیں چھجے کے نیچے آجائیں ورنہ سردی لگ جائے گی '' شوہر نے تلخی سے طنز کیا ''تو وہاں تم نے میرے لیے کون سی برساتی ٹانگ رکھی ہے...... وہاں بھی یہ پانی برسے گا مجھ پر......'' کاجل چپ ہوگئی۔ اتنے میں نعمان کو اپنی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا ڈرائیور گاڑی ٹھیک کروا چکا تھا۔ نعمان کو احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سے وہاں کھڑا ہے کاجل نے بھی نعمان کی گاڑی کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ کبھی اس نے نعمان کو کہا تھا کہ اسے سرخ رنگ کی کاریں بہت پسند ہیں اور آج نعمان کے پاس ویسی ہی ایک چمچماتی سرخ رنگ کی نئی کار تھی۔ نعمان نے اپنی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلی کاجل پر ایک بھرائی ہوئی اور الوداعی نظر ڈالی۔ کاجل بھی اُسی کو دیکھ رہی تھی۔ بارش نے نعمان کے آنسو چھپا لیے تھے۔ گاڑی نے ایک جھٹکا لیا اور پانی کے چھینٹے اڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ کاجل اور نعمان کی نظر آخری بار ملی۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ شاید یہ ان کے نصیب کی آخری نظر ہے۔ مگر جن کے مقدر پہلے ہی چوک گئے ہوں انہیں بھلا اس آخری نظر میں ایک دوسرے کو کیسے نہار پاتے...... ؟ گاڑی گزرنے کے بعد بھی کاجل بہت دیر تک اس جانب دیکھتی رہی جہاں بہت دور جا کر نعمان کی سرخ گاڑی کہرے میں گم ہو چکی تھی۔ اچانک اسے اپنے عقب میں اپنے شوہر کی ہیجانی آواز سنائی دی...... ''ارے...... یہ دیکھو...... وہ گاڑی والے صاحب اپنا رین کوٹ تو یہیں بھول گئے۔ واہ مولا...... آج ہی تجھ سے مانگا تھا''

کاجل چونک کر پلٹی اس کے شوہر کے ہاتھ میں وہی نیلا رین کوٹ تھا جو کبھی خود اس نے نعمان کو تحفے میں دیا تھا۔ نعمان جاتے ہوئے جان بوجھ کر وہ رین کوٹ بس اسٹاپ کی ریلنگ پر چھوڑ گیا تھا۔ کاجل نے دھیرے سے خود کلامی کی ''ہاں...... شاید وہ اسے آپ کے لیے ہی چھوڑ گئے ہیں...... اس رین کوٹ کا سفر بس یہیں کا تھا......''

ریحان اپنی دھن میں مگن رین کوٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا، اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب کاجل کی آنکھ سے دو آنسو ٹپک کر زمین پر بہتے بارش کے پانی میں مل کر امر ہو گئے۔



21 مئی ...... (نثری نظم)

جب تاروں کی چمک دُگنی ہو جائے

اور سلگتے چاند کا ہر داغ دھل جائے ......

جب یہ بوجھل پلکیں کرنوں کو چھو لیں

اور یہ تپتا سورج تم پہ خود سایہ بن جائے

جب دنیا کا ہر سُر کسی دُھن میں ڈھلنے لگے

اور کائنات کی ہر دُھن، کسی ایک کے نام ہو جائے

جب تیز لمحے صدیوں میں بدلنے لگیں

اور دل کی ہر دھڑکن خود ایک لمحہ بن جائے ......

جب منزلیں آپ اپنے راستوں کو پکارنے لگیں

اور ہر رستہ تمہارے لیے، خود ایک منزل بن جائے ......

جب سارے موسم اک شام میں اُترنے لگیں

اوراس دل کا آنگن پانچواں موسم بن جائے……
جب کسی کے کومل قدموں کی آہٹ کی سرگوشی ہو……
اورتمہارے آس پاس کا شور اک نغمے میں ڈھل جائے
جب میرے سب لفظ خاموش ہونے لگیں
اور ہمارے درمیاں ہر گفتگو اضافی ہو جائے
اور پھر……
جب ہر سرگوشی بس ایک ہی بات کہے……
باہر کھلی دھوپ، پر من اندر برسات رہے
دن کو دن سمجھے……رات کو نہ رات کہے
بھیڑ بھی تنہا لگے، اور تنہائی ملاقات رہے……
تو میں جان لوں گا……
ہاں……میں جان لوں گا……
کہ آج تمہارا ''جنم دن'' ہے

(ہاشم ندیم خان)



توبہ اور استغفار (افسانہ)

آج صبح سویرے شوکت کی اپنی بیوی صغراں سے ایک بار پھر شدید جھڑپ ہوگئی تھی لہٰذا شام تک اس کا موڈ بگڑا رہا۔ وہ ریگل سینما کے باہر اپنے دوست بالے کی گنڈیریوں والی ریڑھی کے نزدیک لکڑی کے بنچ پر بیٹھا اندر ہال سے نکلتے فلم بینوں کے چہرے ٹٹول رہا تھا۔ دوسرا شو چھوٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور تماشائیوں کی بھیڑ بتا رہی تھی کہ یہ انگریزی فلم بھی سینما کے مالک کو کافی کما کر دے جائے گی۔ جبکہ سڑک کی دوسری جانب ناولٹی سینما میں لگی محمد علی، شبنم کی اُردو فلم کا ہال سنسان پڑا ہوا تھا۔ شوکت حیرت سے انگریزی فلم کے شائقین کے چہرے دیکھ رہا تھا جو اُسی کی طرح غربت کی تصویر اور کسی گلی محلے کے نقو، خیرو، کرمو، گامے اور مجھے لگ رہے تھے۔ پھر نہ جانے انہیں اس انگریزی فلم کی اتنی سمجھ کیسے آجاتی تھی؟ دراصل ریگل سینما شہر کے وسطی علاقے میں غریبوں کی بستی سے ملحق تھا لہٰذا یہاں بابو ٹائپ لوگ فلم دیکھنے کے لیے ذرا کم ہی آتے تھے۔ لیکن پھر بھی انگریزی فلم کا رش کبھی نہیں ٹوٹا۔

بالے کے ہاتھ تیزی سے گنا کاٹنے والی مشین پر چل رہے تھے اور اس سے کہیں تیز اس کی زبان چل رہی تھی۔ ''چل اب جانے بھی دے شوکی یار...... نہ لڑا کر بھابھی کے ساتھ......وہ بے چاری تجھ سے کیا مانگتی ہے......؟ بس اتنا ہی کہتی ہے نا کہ جوا کھیلنا چھوڑ دے...... تو ایسا کیا برا کرتی ہے وہ کرم جلی......؟'' شوکت کو غصہ آگیا ''اگر تو نے بھی یہ وعظ کرنے ہیں تو میں چلتا ہوں......'' بالے نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھالیا ''اوہو......ایک تو تیرا غصہ بڑا تیز ہے......اچھا چل رہن دے......یہ لے ٹھنڈی میٹھی گنڈیریاں کھا......شاید کچھ اثر ہو جائے'' ......بالے نے ایک بڑی چھابڑی میں تازہ کٹی ہوئی گنڈیریاں شوکت کے

سامنے رکھ دیں۔ شوکت کا پارہ کچھ نیچے آنے لگا۔ اُس نے ایک بڑی سی گنڈیری اٹھا کر منہ میں ڈالی اور شکر بھرے رس نے اس کے اعصاب کا تناؤ کافی حد تک کم کر دیا۔ ''کیا کروں یار بالے...... ہزار بار توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی بازی نہیں کھیلوں گا...... مگر تاش کے پتے سامنے آتے ہی ساری توبہ ٹوٹ جاتی ہے...... ہاتھ مچلنے لگتے ہیں اور میرے اندر کا جواری باہر نکل آتا ہے۔ تو تو جانتا ہے...... جواری کے لیے جوئے سے بڑا نشہ اور کوئی نہیں ہوتا...... تو خود بھی تو بڑا پتے باز تھا کسی زمانے میں......'' بالے کی آنکھوں میں ماضی کے سائے لہرائے ''ٹھیک کہتا ہے یار...... مگر رب سوہنے کا لکھ شکر۔ اس نے مجھے اس لت سے آزاد کر دیا...... اب بڑا سکون ہے اس حلال کی کمائی میں۔ اسی لیے تو تجھے بھی کہتا ہوں...... چھوڑ دے یہ قمار بازی...... اس میں کمایا لاکھ بھی خاک ہے......'' بالا پھر سے گنڈیریاں کاٹنے میں مشغول ہو گیا اور شوکت وہیں بیٹھے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

رات گئے جب شوکت اپنے گھر پہنچا تو تینوں بچے سو چکے تھے۔ صغراں ماتھے پر پٹی باندھے بخار میں تپ رہی تھی۔ پڑوسی کی بیوی اُسے سرکاری ڈسپنسری کا شربت پلا گئی تھی لیکن صغراں کا بخار چڑھتا ہی جا رہا تھا۔ شوکت کچھ پریشان ہو گیا کیونکہ شہر میں ان دنوں ڈینگی کے مچھر کا بخار تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اُس نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ وہ صبح پہلی فرصت میں صغراں کو بڑے سرکاری ہسپتال لے جا کر اس کا معائنہ کروائے گا۔ وہاں کرم دین وارڈ بوائے سے اس کی پرانی علیک سلیک تھی اور وہ ہسپتال کے اسٹور سے دوائیں دلوانے میں بھی کئی بار شوکت کی مدد کر چکا تھا۔ ورنہ آج کل بڑے سرکاری ہسپتالوں میں بھلا کون کسی کو پوچھتا ہے!؟ شوکت کھانا کھائے بغیر ہی بان کی کھردری چارپائی پر ہاتھ سر کے نیچے دے کر لیٹ گیا۔ اسکی اور صغراں کی شادی کو دس سال ہونے کو آئے تھے...... شروع میں شوکت ایک نجی بس کمپنی میں منشی گیری کا دھندا کرتا تھا اور صغراں کو بھی اس نے پہلی مرتبہ اپنے شہر کے بس اڈے پر ہی دیکھا تھا۔ جب وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ پہلی نظر میں ہی صغراں شوکت کے دل میں کھب کر رہ گئی اور اس نے رشتہ بھجوانے میں دیر نہ کی۔ صغراں کے ماں باپ سیدھے سادھے اور شریف لوگ تھے اور انہوں نے لڑکے کو برسرِ روزگار اور اکیلا دیکھ کر ہامی بھرنے میں وقت نہیں لگایا۔ یوں تیسرے مہینے ہی صغراں اپنے گاؤں سے بیاہ کر شوکت کے شہر آ گئی۔ جہاں اس کے اپنے کچھ دور کے رشتہ دار بھی بستے تھے۔ شوکت نے ہر طرح سے صغراں کے ناز اُٹھائے اور مہینے میں ایک بار وہ خود صغراں کو اس کے میکے ضرور لے کر جاتا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب شوکت کو جوئے کی لت نہیں لگی تھی لیکن شادی کے چھ ماہ بعد ہی ایک شام جب اڈے کی ساری بسیں اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو چکی تھیں اور شوکت اپنا کام ختم کر کے سیٹھ کے پیسے دراز میں رکھ ہی رہا تھا کہ اس کا پرانا جگری یار بالا آ پہنچا۔ بالے نے شوکت کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈی دیکھی تو اس کی رال ٹپکنے لگی ''یار شوکی...... اتنے پیسے یوں ہی اس تجوری میں پڑے سڑتے رہیں گے رات بھر......؟ اور تو صبح ہوتے ہی جا کر انہیں بینک میں ڈال دے

گا..... پر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی یار..... میری مان تو آج ان پیسوں سے اپنی قسمت آزماتے ہیں۔ جیت گئے تو آدھا آدھا.....اور ہارے تو سارا نقصان میرا..... بول.....کیا بولتا ہے.....'' شوکی بالے کی جوئے کی عادت سے خوب واقف تھا۔''نہیں بالے..... یہ کھیل میرے بس کا نہیں ہے.....وہ کہتے ہیں نا.....''جوا کسی کا نہ ہوا'' میں کوئی نقصان کر بیٹھا تو اپنے سیٹھ کو کیا جواب دوں گا.....؟ مجھے غلط پٹیاں نہ پڑھا.....'' بالے نے اُسے رجھانے کی بھرپور کوشش کی''اوہو..... تیرا کوئی نقصان نہیں ہونے دوں گا میں.....تو بس بازی لگانا..... جیت گئے تو اپنے وارے نیارے.....اور اگر تو ہارا بھی تو تیرے پیسے میں اُسی وقت تجھے جوڑ دوں گا..... چاہے مجھے خود کو ہی گروی کیوں نہ رکھنا پڑے.....تو جانتا ہے بالے کی بڑی ساکھ ہے اس ساقی خانے میں..... صبح ہونے سے پہلے تو اپنے سیٹھ کی رقم واپس رکھ دینا اس تجوری میں..... مجھے تو بس بازی میں لگانے کے لیے شروع کی رقم کی ضرورت ہے.....ایک بار بازی چل پڑی تو پھر چل سو چل.....سوچ..... یہ ہزاروں ہیں.....ایک ہاتھ بھی سیدھا پڑ گیا تو لاکھوں ہوں گے اپنے پاس.....اعتبار کر میرا.....'' شوکت سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے بہت دنوں سے صغراں کو سونے کی دو چوڑیاں بنوا کر دینے کا وعدہ کر رکھا تھا آخر کار اس نے اپنے اندر کے تمام وسوسوں کو دبا کر یہ بازی کھیلنے کا فیصلہ کر لیا لیکن راستے بھر وہ بالے سے یہی وعدہ لیتا رہا کہ ہارنے کی صورت میں بالا اس کی پوری رقم واپس دلوانے کا ذمہ دار ہوگا اور بالا سر ہلا ہلا کر اسے یقین دلاتا رہا۔ کہتے ہیں جوا انسان کے ضمیر میں اپنے نوکیلے پنجے گاڑنے کے لیے پہلی بازی سدا اس کنوارے جواری کے نام لکھتا ہے جس نے زندگی میں پہلی بار پانسہ ڈالا ہوتا ہے وہ رات بھی شوکت کے نام لکھ دی گئی تھی۔ ہارنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور وہ پانسہ پھینکتا اور جیتتا رہا۔ رات تین بجے جب وہ دونوں بادل نخواستہ جوئے خانے سے اٹھے تو ان دونوں کی جیبوں سے پیسے گر رہے تھے۔ شوکت نے گھر جانے سے پہلے سیٹھ کی رقم تجوری میں رکھ دی اور اگلے دو روز کی چھٹی کر لی۔ جوے کا پیسہ انسان کے قدم جوئے خانے کی طرف ہی کھینچتا ہے۔ اور اگلی شام شوکت اور بالے کے قدم بھی پر اُسی ساقی خانے کی ڈگر پر رواں دواں تھے۔ آج تو شوکت کو روپے پیسے کی کوئی فکر بھی نہیں تھی کیونکہ آج اس کے پاس اپنی رقم موجود تھی۔ لہٰذا اس نے دل کھول کر بازی لگائی۔ جواری کی جھجک جب ٹوٹ جائے اور دل بڑا ہو تو پھر اس کی قسمت بھی اس کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ وہ دوسری رات فجر کی روشنی ہونے تک ان پر مہربان رہی۔ بالے نے ایک مقام پر آ کر اپنے پیسے سمیٹ کر ہاتھ روک لیا اور نظروں نظروں میں شوکت کو بھی بازی لپیٹنے کا اشارہ کیا لیکن شوکت کا ہاتھ نہ رک سکا اور وہ پانسے پر پانسہ اور پتے پر پتہ پھینکتا رہا اور جیت سمیٹتا رہا۔ اور پھر یہ بازی دس سالوں پر محیط ہوتی چلی گئی۔ شوکت نے منشی کی نوکری چھوڑ دی اور اس کے شب و روز جوے کی نذر ہونے لگے۔ صغراں نے یکے بعد دیگر دو لڑکوں اور ایک لڑکی کو جنم دیا تو گھر کے خرچے بھی بڑھ گئے۔ لیکن قسمت نے دوبارہ کبھی پہلی دو راتوں کی طرح کھل کر شوکت کا ساتھ نہ دیا۔ وہ ایک بار ہارا تو پھر

ہارتا ہی چلا گیا۔ شاید ہر جواری کے نصیب کی ایک بازی ضرور ہوتی ہے۔ شوکت اپنے نصیب کی وہ بازی پچھلی دو راتوں میں ہی بھگتا چکا تھا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اُس کے مقدر کی وہ بازی اُسے سول لائن کے ان پرانے بوسیدہ کوارٹروں کے ایک جوئے خانے میں ملی جہاں دس پندرہ ہزار سے اوپر کا پتا نہیں پھینکا جاتا تھا اور رات بھر میں صرف چالیس پچاس ہزار کا جوا ہوتا تھا۔ اگر یہی بازی شوکت کو شہر کے کسی پانچ ستارہ ہوٹل یا کسی ارب پتی کے بنگلے میں ملتی تو شاید وہ اپنی دو راتوں میں اپنی سات نسلوں کے لیے کما جاتا۔ لیکن سب سے بڑی بازی تو ہمارا نصیب خود ہمارے ساتھ کھیلتا ہے۔ لہٰذا شوکت بھی اپنی تقدیر کی بازیاں ہارتا چلا گیا اور نوبت صغراں کے زیور بیچنے تک آ گئی۔ صغراں اس سے لڑ لڑ کر ہار گئی اور تیسرے بچے کی پیدائش کے بعد تو اُسے چپ ہی لگ گئی۔ اُس کی صحت گرتے گرتے آدھی سے بھی کم رہ گئی تھی اور پھر ہر دوسرے تیسرے روز اُسے بخار آ گھیرتا تھا۔ شوکت بھی اُسے دوا کے پیسے دیتا بھی تو وہ بچوں کے لیے کچھ خرید لیتی تھی۔ لیکن اس مرتبہ کا بخار تو اُترے نہیں اُتر رہا تھا۔ اسی لیے شوکت نے اسے شہر کے بڑے سرکاری ہسپتال میں دکھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہی سوچوں میں صبح ہو گئی اور پڑوسی کے مرغے کی پہلی بانگ کے ساتھ ہی شوکت نے صغراں کو جگا دیا۔ وہ نہ نہ کرتی رہ گئی لیکن شوکت نکڑ سے تانگا پکڑ لایا اور تینوں بچوں سمیت صغراں کو لیے ہسپتال پہنچ گئے کرم دین اسے وارڈ کے باہر ہی مل گیا اور اس نے جلدی ہی دوڑ دھوپ کر کے او پی ڈی میں موجود بڑے ڈاکٹر سے صغراں کے لیے نمبر بھی لے لیا۔ ڈاکٹر نے صغراں کی حالت دیکھی تو وہ پریشان سا ہو گیا اور اس نے شوکت کو تاکید کی کہ چند ضروری ٹیسٹ کروانے تک وہ صغراں کو ہسپتال میں داخل کرا دے۔ ڈاکٹر نے تو وارڈ کی پرچی بھی بنا کر کرم دین کے حوالے کر دی تھی مگر صغراں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ گھر کے ہزار کام پیچھے چھوڑ آئی تھی اور پھر بچوں کو بھی تو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ شوکت نے بہتیرا زور لگایا کہ وہ گھر اور بچوں کو سنبھال لے گا مگر صغراں نہ مانی۔ شوکت کو یہ پریشانی بھی لاحق تھی کہ اگر وہ گھر میں بچوں کے ساتھ رہے گا تو یہاں صغراں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ کرم دین نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ پانچ سو روزانہ والا پرائیویٹ کمرہ لے لے تو وہ ڈیوٹی والی نرس سے منت زاری کر کے شوکت کو بمع تین بچوں کے وہاں رات گزارنے کی اجازت دلوا دے گا۔ شوکت گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ صغراں کو اپنے شوہر کی جیب کی حالت خوب معلوم تھی لہٰذا اس نے شوکت کو واپس گھر چلنے کا کہا اور بہانہ یہ کیا کہ آج وہ اپنے دور کی کسی خالہ یا چچا زاد کو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بلوا لے گی اور اس صورت میں وہ کل ہسپتال آ کر داخل بھی ہو جائے گی دل میں صغراں کا خیال یہ تھا کہ وہ لوٹ پوٹ کر خود ہی ہمیشہ کی طرح ٹھیک ہو جائے گی۔ شوکت بھی یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ کل تک کہیں نہ کہیں سے رقم کا کچھ بندوبست کرنے کے بعد ایک ہی بار صغراں کو علیحدہ کمرے والے وارڈ میں داخل کروا کر جم کر اس کا علاج کروائے گا۔ صغراں اور بچوں کو گھر واپس چھوڑ کر وہ بالے کی طرف چلا آیا۔ بالے کی کایا پلٹے تین سال ہونے کو

آئے تھے اور ان تین سالوں میں اس نے ایک بار بھی پتوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ لیکن اُسے ایک بات کا قلق ہمیشہ رہا تھا کہ شوکت کو اس راہ پر لگانے والا وہ خود ہی تھا۔ اس نے کئی بار شوکت کو پیش کش کی تھی کہ وہ اُسے بھی اس مولوی جی سے ملوانا چاہتا ہے جن کی باتیں سن کر اس کا من پلٹ گیا تھا لیکن شوکت ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔ اس کا دل نماز اور مسجد میں کبھی نہیں لگتا تھا۔ شوکت دکھاوے کے لیے جمعے اور عید کی نماز پر تیار ہو کر تو پہنچ جاتا تھا مگر وہاں بھی وہ رکعتوں اور فرائض میں دھیان لگانے کے بجائے ذہن میں پتے ہی ترتیب دیتا رہتا تھا۔ صغراں کے کہنے پر اس نے کئی بار جوا کھیلنے سے توبہ بھی کی مگر پھر اگلے روز ہی یہ توبہ توڑ بیٹھتا تھا۔ بالے نے شوکت کو دیکھا تو اس کا چہرہ کھل گیا ''آ یار شوکی...... بڑی عمر ہے تیری...... میں ابھی مولوی صاحب سے تیرا ہی ذکر کر رہا تھا...... دیکھ...... آج قدرت نے تیری ملاقات کروا ہی دی نا مولوی جی سے......'' شوکت نے چونک کر بالے کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ ٹھیلے کے ساتھ پڑے ہوئے بنچ کی جانب دیکھا جہاں ایک باریش اور ضعیف شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا سکون اور اطمینان تھا۔ سادہ سے پیوند لگے لیکن صاف ستھرے ڈھلے ہوئے مگر بنا استری کے کپڑوں میں ملبوس وہ شخص بالے کا ''مولوی معظم'' ہی تھا۔ شوکت جو آج بالے سے کچھ ادھار کی اُمید میں یہاں آیا تھا کچھ بددل سا ہو گیا۔ مولوی صاحب کی موجودگی میں بالے سے کھل کر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ہاتھ ملا کر مولوی کے ساتھ بنچ پر بیٹھ گیا ''یار بالے...... آج میں ذرا جلدی میں ہوں...... تیری بھابھی کو بڑا سخت بخار ہے...... اسے ہسپتال میں داخل کروانا ہے میں نے سوچا کہ اگر تجھ سے کچھ رقم......'' ......''ہاں ہاں...... کیوں نہیں...... سات آٹھ سو تو ہیں میرے پاس...... بول کتنے دوں......؟''

شوکت کا موڈ خراب ہو گیا ''نہیں یار...... پانچ سو روپے روزانہ پر کمرہ کرائے پر لینا ہے...... دو چار دن تو لگ ہی جائیں گے ہسپتال میں......'' بالے نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''میرے پاس تو یہی آٹھ ایک سو ہوں گے...... تجھے تو پتہ ہے کہ میں روزانہ چار سو کمیٹی میں بھی ڈال دیتا ہوں......'' شوکت مایوسی سے اُٹھ کھڑا ہوا ''اچھا...... چل خیر...... تو آٹھ سو ہی دے دے...... میں کہیں اور سے بھی پتا کرتا ہوں......'' بالے نے بنڈی سے جیب سے آٹھ سو کی ریزگاری نکالی اور شوکت کے ہاتھ میں تھما دی۔ شوکت جانے لگا تو پیچھے سے مولوی معظم کی آواز سنائی دی ''یہ میرے پاس بھی کچھ پیسے ہیں بھیا...... یہ بھی رکھ لو......'' شوکت چونک کر مڑا۔ مولوی معظم کے ہاتھ میں پانچ سو کے تین نوٹ تھے۔ ''مجھے آج ہی امامت کی تنخواہ ملی ہے محلے والوں سے...... میری ضروریات کچھ زیادہ نہیں ہیں...... تم ان سے اپنی بیوی کا علاج کروا لینا'' شوکت نے گھبرا کر انکار کیا ''نہ جی...... میں آپ کے پیسے بھلا کیسے لے سکتا ہوں...... آپ سے تو میری کوئی واقفیت بھی نہیں'' مولوی مسکرایا ''بھئی تم اقبال کے دوست ہو...... اس رشتے سے میرے بھی کچھ ہوئے ناں...... لو رکھ لو......'' مولوی نے زبردستی پیسے شوکت کی جیب میں ڈال دیے۔ اقبال عرف بالے کی آنکھیں بھر آئیں ''مولوی جی...... آپ

میرے یار شوکی کے لیے بھی دعا کریں ناں..... یہ بہت بار جوئے سے توبہ کر کے توڑ چکا ہے..... آپ دعا کرو کہ اس بار اسکی توبہ قبول ہو جائے.....'' شوکت نے سر جھکا دیا۔ مولوی نے مسکرا کر شوکت کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''نہیں..... ابھی اس نے توبہ نہیں کی..... فی الحال تو یہ صرف استغفار کر رہا ہے..... جب بھی دل سے توبہ کرے گا..... اسی دن جوئے کی لت چھوٹ جائے گی۔'' بالے نے حیرت سے مولوی معظم کی طرف دیکھا ''یہ کیا بات ہوئی مولوی جی..... بھلا توبہ اور استغفار میں بھی کوئی فرق ہوتا ہے.....؟'' ..... ''ہاں..... بڑا فرق ہے..... توبہ گناہ سے پہلے کی جاتی ہے اور استغفار گناہ کے بعد..... یوں سمجھ لو کہ توبہ پرہیز ہے اور استغفار دوا..... ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بد پرہیزی ہماری روح کو بیمار کر دے گی..... گناہ کیے جاتے ہیں..... اور پھر جب گناہ کا احساس ہوتا ہے تو استغفار کی دوا سے اُس گناہ کی بیماری کا گھاؤ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گناہ سے پہلے ہی پرہیز والی توبہ کر لیں تو بعد میں دوا والی استغفار کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور جب ہم گناہ کے بعد معافی مانگتے ہیں تو ہمارا دل جانتا ہے کہ ہم گناہ سے ہمیشہ توبہ کر رہے ہیں یا بار بار کی استغفار طلب کر رہے ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ دل سے توبہ کی جائے تو پھر استغفار کی حاجت نہیں رہتی..... جس دن تمہارے دوست نے جوئے سے سچے دل سے توبہ کی..... یہ دوبارہ پلٹ کر اس ساتی خانے کی طرف نہیں جائے گا..... اور اسے ہر بار گناہ کے بعد کی استغفار کی شرمندگی سے بھی نجات مل جائے گی..... البتہ یاد رہے کہ توبہ اور استغفار دونوں ہی اللہ کو پسند ہیں.....''

شوکت مولوی معظم کی باتوں میں اُلجھا شام کو اپنے محلے میں داخل ہوا تو اسے نورے حلوائی کی دوکان کے پاس ہی کریم بخش مل گیا۔ اس نے جلدی سے شوکت کا ہاتھ پکڑ لیا ''اوئے شوکی..... کہاں غائب ہے تو تین دن سے..... چل جلدی کر..... آج پورے پچاس ہزار کی بازی لگے گی پچھلی گلی میں..... سب تیرے بنا بہت اداس ہیں وہاں.....'' شوکت نے انکار میں سر ہلایا ''نہیں کرمو..... آج نہیں..... گھر والی بیمار پڑی ہے..... پھر کبھی سہی.....'' کریم بخش نے شوکت کو جانے نہیں دیا ''بڑا بے مروت ہو گیا ہے تو..... دو گھڑی کے لیے تو چلا چل..... نہ لگانا بازی..... اب کیا یاروں کو اپنے دیدار سے بھی محروم رکھے گا.....؟'' شوکت نے ہتھیار ڈال دیئے..... ٹھیک اسی لمحے اسکا بڑا دس سالہ بیٹا کامی گھر سے باہر نکلا اور باپ کو دروازے سے واپس پلٹتے دیکھ کر پوچھ بیٹھا ''کہاں جا رہا ہے ابا؟'' ..... ''کہیں نہیں..... جا کر اپنی ماں کو بتا دے کہ میں پچھلی گلی میں دوستوں کے ساتھ گپ لگا رہا ہوں..... جلدی آ جاؤں گا..... کوئی ضروری کام ہو تو مجھے سکندر چاچے کی کچی کوٹھی سے آ کر بلوا لینا.....'' سکندر شوکت کے محلے میں ہی ہر ہفتے کی رات بازی لگواتا تھا اور خوب پتے چلتے تھے رات بھر۔ شوکت کرمو کے ساتھ سکندر کے اڈے پر داخل ہوا تو دھوئیں اور چرس کی باس نے سارے کمرے کا ماحول آلودہ کر رکھا تھا۔ لیکن جواریوں کے لیے یہی فضا تازہ آکسیجن کا کام کرتی تھی۔ سو شوکت بھی جلد ہی

اس ماحول میں گھل مل گیا کچھ دیر تک تو وہ صرف پتے پر پتا گرتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر رفتہ رفتہ اسکے اندر کا جواری بیدار ہونے لگا اسنے پہلی بازی میں بالے کے دیئے ہوئے آٹھ سو ایک ایک سو کر کے جھونک دیئے...... لیکن بازی لمبی ہوتی گئی اور جب پہلی مرتبہ اس کے بیٹے کامی نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں جھانک کر اپنے باپ کو آواز دی تب تک شوکت پانچ سو ہار چکا تھا کامی ہلکایا "وہ ابا...... اماں بلاتی ہے......" شوکت نے اسے جھاڑ دیا "آتا ہوں...... جا بھاگ جا یہاں سے......" کامی واپس دوڑ گیا۔ دوسری مرتبہ آنے میں کامی نے دو گھنٹے لیے "ابا...... اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے...... وہ بلا رہی ہے......" اس بار شوکت پتے پھینٹنے میں اس قدر مگن تھا کہ اس نے کامی کو کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ بالے کے دیئے ہوئے آٹھ سو شوکت تیسری بازی میں ہار چکا تھا لیکن مولوی کے دیئے ہوئے پندرہ سو بڑے برکتی نکلے اور بازی پلٹنے لگی۔ تیسری مرتبہ کامی نے اندر جھانکا تو رات آدھی بیت چکی تھی۔ "ابا...... وہ اماں......" جھلائے ہوئے شوکت نے پیر کا جوتا نکال کر اس کی طرف پھینکا "تو جاتا ہے یا......؟" کامی ڈر کر بھاگ گیا۔ رات دو بجے کے بعد شوکت کی قسمت جاگنے لگی۔ مولوی کے روپے دوسرے جواریوں کے روپے کھینچنے لگ گئے تھے اور شوکت کے سامنے سو پچاس کے نوٹوں کی ڈھیری بڑھتی جا رہی تھی۔ چوتھی مرتبہ کامی روتا ہوا اندر آیا تو فجر ہونے والی تھی "ابا وہ اماں کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے...... تو جلدی سے گھر آ جا......" شوکت دس ہزار داؤ پر لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے کامی کو دیکھے بنا جواب دیا "تو چل...... بس یہ بازی ختم ہو تو آتا ہوں...... اور سن...... اپنی ماں کو انگیٹھی پر رکھی سرخ دوا پلا دینا......" لیکن شوکت بھی جانتا تھا کہ اُسے ابھی یہاں بہت دیر لگنے والی ہے کیونکہ جواری کی آخری بازی کبھی نہیں آتی۔ آخری سانس البتہ پہلے آ جاتی ہے۔ سو شوکت کی آخری بازی نے رات کے سینے کو پھاڑ کر سورج کے باہر نکلنے تک کا وقت لے لیا۔ کامی اس کے بعد باپ کو بلانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ شوکت نے اپنی جیتی ہوئی رقم گنی نہیں تھی لیکن اسے یقین تھا کہ پینتیس چالیس ہزار ضرور ہوں گے۔ اس نے ایک لمبی اور آسودہ انگڑائی لی اور رقم اپنی جیبوں میں بھر کر جوا خانے سے باہر نکل آیا۔ دن چڑھ آیا تھا اور گھروں کے مرد اپنے کام کاج پر کب کے نکل چکے تھے۔ شوکت اپنی گلی میں داخل ہوا تو کچھ عجیب سی خاموشی تھی۔ کامی اپنے دونوں چھوٹے بھائی بہن کو لیے گلی کے کونے میں پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ شوکت کے دروازے کے قریب کچھ محلے دار بزرگ خاموش کھڑے تھے۔ وہ سب شوکت کو دیکھ کر آپس میں زیرِ لب کچھ بڑبڑائے۔ شوکت جلدی سے آگے بڑھا "کیا ہوا؟ سب خیر تو ہے ناں......" ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا "تو ساری رات جوا کھیلتا رہا اور یہاں تیری صغراں زندگی کی بازی ہار گئی۔ تو نے آنے میں بہت دیر کر دی شوکی بیٹا......" شوکت کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ کر گر پڑا۔ وہ دیوانہ وار گھر کے دروازے کی جانب دوڑا۔ پیچھے سے کوئی پڑوسی چلایا "وہ گھر میں نہیں ہے...... ڈاکٹر نے جلد دفنانے کی ہدایت کی تھی۔ بھاگنا ہے تو قبرستان کی طرف

بھاگ......شاید آخری بار چہرہ دیکھنے کا موقع مل جائے......'' شوکت ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ اس کے بچے اُسے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح قبرستان کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ شوکت کے کانوں میں مولوی معظم کے جملے گونج رہے تھے ''نہیں......ابھی اس نے سچے دل سے توبہ نہیں کی......یہ تو صرف استغفار پر ہی گزارہ کر رہا ہے......'' شوکت زاروقطار روتے ہوئے قبرستان کی طرف دوڑ رہا تھا اور اپنی جیبوں سے نوٹ ہوا میں اُچھالتے ہوئے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ''میں نے توبہ کی میرے مالک......میں نے سچے دل سے توبہ کی......مجھے معاف کر دے مولا......میری توبہ قبول کر......توبہ......توبہ......توبہ......''



جلاد (افسانہ)

اندھیری گلی کے سرے پر ایک کم زور سا بلب ٹمٹما رہا تھا اور تیز چلتی ہوا اس جھولتے ہوئے بلب کی ٹیالی سی پیلی پیلی روشنی کے دائرے کو گلی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک دھکیل رہی تھی۔ اکرم کو اس گلی کے نکڑ پر کھڑے قریباً دو گھنٹے ہونے والے تھے اور اب اُسے نکڑ کی بند دوکان کے لکڑی کے پرانے بوسیدہ دروازے کی کڑیاں اور جوڑ بھی گن گن کر زبانی یاد ہو چکے تھے۔ طوفانی رات تھی کہ ڈھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور انتظار تھا کہ پل پل مزید طویل ہوتا جا رہا تھا۔

انتظار چاہے لمحاتی ہو تب بھی گھنٹوں کے برابر ہوتا ہے اور اکرم کو تو واقعی یہاں کھڑے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اُس نے دور بجتے کسی گھنٹہ گھر سے دو بجے کا گجر سنا تو مایوس ہو کر واپسی کی ٹھانی۔ اور ٹھیک اُسی لمحے اندھیرے میں ایک ہلکی سی سرگوشی گونجی ''معاف کرنا ..... مجھے آنے میں کچھ دیر ہو گئی...... سارے شہر میں پولیس کے پہرے لگے ہیں...... راستہ بدلنا پڑا ...'' اکرم نے اندھیرے میں کھڑے شخص کا چہرہ پہچاننے کی ناکام کوشش کی ''اب آگے کیا کرنا ہے؟ ...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تم لوگوں کا کام کروں گا...... لیکن معاوضہ کچھ بڑھانا ہوگا......'' اجنبی اندھیرے سے روشنی میں آ گیا اس نے چہرہ سیاہ مفلر سے لپیٹ رکھا تھا۔ ''معاوضے کی تم فکر نہ کرو...... اتنا پیسہ ملے گا کہ تمہاری سات نسلیں گنتی پھریں گی...... لیکن پہلے تمہیں اپنا اعتماد قائم کرنا ہوگا۔ ہمیں یقین دلانا ہوگا کہ تم ہمارے وفادار ہو......'' اکرم نے سر ہلایا ''میں تیار ہوں......'' اجنبی نے جیب سے کچھ روپے نکال کر اکرم کے ہاتھ میں تھمائے۔ ''ٹھیک ہے...... تو پھر کل شام یہیں ملنا مجھے...... کل تیرہ اگست ہے...... تمہیں ایک تیار کی گئی موٹر سائیکل دی جائے گی جسے 14 اگست کی صبح شہر کے مرکزی جلسے میں

لے جا کر کھڑا کرنا ہوگا۔ اگر تم نے یہ کام ٹھیک طرح سے کیا تو پھر اگلا کام بتاؤں گا تمہیں...... لیکن یاد رہے... اگر کہیں کم زور پڑے یا پیٹھ دکھانے کی کوشش کی تو ہم غداروں سے نپٹنا خوب جانتے ہیں......''

اجنبی اکرم کا جواب سنے بغیر وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ اکرم نے ہاتھ میں پکڑے پیسے گنے۔ اُسے بیعانے کے طور پر ملے پانچ ہزار کے کڑک نوٹ دیکھ کر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اتنے مہینوں کی بے روزگاری کے بعد اچانک اس کے ہاتھ میں اکٹھے پانچ ہزار کی رقم آ گئی ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ واپس جاتے ہوئے راستے سے اپنے 10 سالہ بیٹے گڈو کے لیے کوئی کھلونا اور گھر کے لیے کوئی کھانے کی چیز لیتا جائے۔ لیکن رات بہت بیت چکی تھی اور اسے سارے راستے سوائے ایک آدھ میڈیکل اسٹور کے اور کوئی دوکان کھلی دکھائی نہیں دی تو اس نے مزید تلاش کا سلسلہ کل پر موقوف کر دیا۔ ویسے بھی اس کا باپ اعظم بڑا شکی مزاج شخص تھا۔ اُسے حلال کے پیسے کی لت پڑی ہوئی تھی اور تیس سالہ سرکاری نوکری میں اُس نے اپنی اولاد اور اپنے خاندان کے حلق میں حرام کا ایک نوالہ بھی نہیں جانے دیا تھا۔ اعظم کی بیوی اکرم کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی اور اعظم نے ہی اپنی بڑی بیٹی رشیدہ اور اکرم کی پرورش کی تھی۔ رشیدہ بہت عرصہ پہلے بیاہ کر اپنے شوہر کے ساتھ دوسرے شہر جا چکی تھی۔ کبھی کبھار خط آ جاتا تھا اُس کا جس میں اکرم کے لیے صرف یہی نصیحت ہوتی تھی کہ وہ بوڑھے باپ کا خیال رکھا کرے۔ رشیدہ کا شوہر پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھا اور اس کا اپنا کنبہ چھ بچوں پر پھیل چکا تھا لہٰذا اس کا اپنا ہاتھ بھی تنگ رہتا تھا لیکن سال چھ مہینے میں باپ کے لیے گرم سویٹر یا اکرم اور اس کی بیوی کے لیے خالص گھی یا گھر کا بنا تازہ میوے والا گڑ بھیجتی رہتی تھی۔ اکرم کی شادی سکینہ سے ہوئی تو رشیدہ کو اپنے باپ اور بھائی کی جانب سے کچھ اطمینان نصیب ہوا کہ اب گھر میں عورت آ گئی ہے تو وہ ان دو چھڑوں کا بھی کچھ سہارا ثابت ہوگی اور مکان کو گھر میں بدل دے گی۔ شروع کے چند سال سکینہ نے بھی خوب نبھائی لیکن جب اس کا اکلوتا بیٹا گڈو پانچ سال سے اوپر کا ہونے لگا اور اکرم کے تیور نہ بدلے تو وہ بھی چڑنے لگی۔ اکرم نے بمشکل آٹھویں پاس کی تھی اور اس کا کسی کام میں مستقل دل نہیں لگتا تھا۔ ہر تین ماہ بعد اُسے اپنا پرانا کام عذاب لگنے لگتا تھا اور وہ سب چھوڑ چھاڑ گھر میں پڑ جاتا۔ وہ اب تک ٹکٹ بلیک کرنے سے لے کر گنے کے رس کی مشین کا ٹھیہ لگانے تک ہر کام کر چکا تھا۔ کچھ عرصہ نیاری اور پھر پرچون کی دوکان بھی ڈالی مگر حسبِ معمول اس کا دل ان کاموں سے جلد بھر گیا۔ اعظم اپنی ساری جمع پونجی اور پینشن سمیت گریجویٹی کی ساری رقم اپنے بیٹے کے ان ناکام تجربوں کی نظر کر چکا تھا اور پھر جب نوبت فاقوں تک پہنچنے لگی تو سکینہ کے اپنے میکے کے چکر طویل ہونے لگے وہ شروع میں ایک آدھ دن کے لیے اور پھر دو تین رات کے لیے گھر جانے لگی۔ اُسے خود سے زیادہ اپنے لاڈلے گڈو کی خوراک کی فکر ستاتی رہتی تھی کیونکہ یہ اُس کے بڑھنے کے دن تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا رات کو پانی، نمک اور مرچ کے

جھوٹے شوربے میں باسی روٹیاں بھگو کر کھائے اور روتے روتے سو جائے لہٰذا وہ ہر ہفتے کسی نہ کسی بہانے اپنے میکے پہنچ جاتی تھی۔ اسکا سسر اعظم بھی بیٹے کی بے روزگاری اور غیر مستقل مزاجی سے بے حد پریشان رہتا تھا اور اس نے تنگ آ کر خود صدر بازار میں پرانی گھڑیوں کی مرمت کے لیے ایک کھوکھا کرائے پر لے لیا تھا یہ اس کا بچپن کا شوق تھا جو اب بڑھاپے میں اس کے کام آ رہا تھا۔ کیسی اور کتنی بھی پرانی بند گھڑی ہو وہ اسے منٹوں میں کھول کر اس کے مرض تک پہنچ جاتا تھا لیکن آج کل کی نئی ڈیجیٹل اور نمبر والی گھڑیوں نے یہ پیشہ بھی زوال پذیر کر دیا تھا لہٰذا اعظم کبھی کبھی سارا دن کسی گاہک کے انتظار میں ہی گزار دیتا تھا۔ اسنے تیس سال تک بڑی ایمان داری سے جیل کی نوکری کی تھی لیکن جیل میں اُس کا کام کچھ ایسا تھا کہ لوگ عام طور پر اس کا پیشہ سنتے ہی اپنا راستہ بدل لیتے تھے اعظم اپنی ڈسٹرکٹ کے سنٹرل جیل میں جلاد کی نوکری پر فائز تھا اور ان تیس سالوں میں اس نے نہ جانے کتنے گناہ گاروں کو تختے کا لیور کھینچ کر موت کی وادی میں پہنچایا تھا کون جانے ان پھانسی پانے والوں میں سے کئی بے گناہ بھی ہوں لیکن یہ فیصلہ کرنا تو سرکار اور عدالت کا کام تھا۔ اعظم تو بس ایک جھٹکے سے پھانسی گھاٹ کا لیور کھینچنے پر معمور تھا۔ اب لٹکنے والا کون تھا اور کس جرم کی سزا اور پاداش میں سولی جھولتا تھا اس سے اعظم کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو بس اپنا کام بڑی ایمانداری سے کرتا تھا۔ اسنے ایک مرتبہ جیل کے بڑے ڈاکٹر سے سنا تھا کہ ''بہترین پھانسی'' وہ ہوتی ہے جس سے پھندے پر لٹکنے والا زیادہ نہ تڑپے اور ایک جھٹکے سے اُس کی جان نکل جائے لیکن اس بہترین سولی کا سارا انتظام جیل کے جلاد یعنی اعظم کی ذمہ داری تھا۔ لہٰذا وہ ہر صبح اپنی ڈیوٹی پر آتے ہی سب سے پہلے پھانسی گھاٹ کے احاطے میں نصب اس قاتل چبوترے کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیتا تھا کہ کہیں کسی پیچ، نٹ یا ہولے کے قبضے کو تیل کی ضرورت تو نہیں کہیں کھلنے والے دو تختوں میں کوئی درز چیخ تو نہیں رہی۔ لیور کی آہنی راڈ کو کہیں سے زنگ تو نہیں کھا رہا۔ لیور کہیں اٹکتا تو نہیں یا پھندے کی رسی کہیں سے ادھڑ تو نہیں رہی؟؟ اعظم روز صبح نماز کے بعد منہ اندھیرے گھاٹ پر پہنچ کر دن چڑھنے تک یہ سارے کام ایک نہ ختم ہونے والی دل جمعی کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ اور باقی عملہ اکثر اس کا مذاق اڑاتا کہ وہ روزانہ صبح اس طرح پھانسی گھاٹ تیار کرتا ہے جیسے وہاں دن میں روزانہ ایک پھانسی بھگتائی جاتی ہو۔ جس کا جواب اعظم ہمیشہ مسکرا کر ہی دیتا کہ پھانسی چاہے سال بھر میں صرف ایک ہی کیوں نہ ہو......اس کا فرض ہے کہ وہ قیدی کو زیادہ تکلیف سے بچانے کے لیے یہ سارے انتظامات دیکھتا رہے۔ جیلر اُسے چھیڑتا کہ جس قیدی نے چند لمحوں بعد مر ہی جانا ہے بھلا اس کی تکلیف کی کمی یا زیادتی کا کیا مطلب؟ لیکن اعظم کانوں کو ہاتھ لگا کر جواب دیتا کہ اگلے جہاں میں اُس سے اس بات کی پوچھ بھی ضرور ہوگی کہ اس کی ذرا سی لاپرواہی سے پھانسی جھولنے والے نے زیادہ تڑپ کر جان کیوں دی؟ جانے لوگوں کے ذہن میں جلاد کا نام آتے ہی ایک انتہائی خون خوار، سیاہ رنگت اور سرخ آنکھوں والے کالے حبشی کا تصور کیوں ابھر آتا تھا جو اپنے

کڑیل جسم پر خوب تیل ملے اور ہاتھ میں چمکتی تلوار لیے سزائے موت پانے والے قیدی کے جھکے ہوئے سر پر وار کرنے کے لیے تیار کھڑا ہو۔ شاید زمانہ قدیم کے جلاد ایسے ہی ہوتے ہوں مگر جب سے یہ پھانسی گھاٹ ''ایجاد'' ہوئے تھے پھانسی کافی حد تک ایک میکانکی عمل بن کر رہ گئی تھی اب اس کا تعلق خون کے چھینٹوں اور تڑپتے جسم کے ساتھ بھی تو نہیں رہا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں لوگ جلاد کا نام سنتے ہی اعظم سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ بہر حال اعظم نے کبھی ان باتوں کی پرواہ نہیں کی اور پورے تیس سال تک اپنا فرض نبھانے کے بعد وہ ریٹائر ہو کر باعزت اپنی ملازمت سے فارغ ہو کر گھر آ بیٹھا تھا۔ اس کی ریٹائرمنٹ کے دن جیل میں باقاعدہ ایک تقریب ہوئی تھی جس میں جیلر صاحب نے اسے تعریفی سند اور محکمہ جیل کی طرف سے انعام کے طور پر تیس بور کا ایک ریوالور بھی تحفے میں دیا تھا جسے آج تک اعظم نے بہت سنبھال کر رکھا تھا اور ہمیشہ اُسے اپنے تکیئے کے نیچے رکھ کر رات کو سویا کرتا تھا۔

اس رات بھی جب اکرم آدھی رات کو گھر پہنچا تو اعظم صحن میں چارپائی ڈالے اُسی کے انتظار میں آنکھیں موندھے لیٹا ہوا تھا۔ اکرم کا بیٹا گڈو آج پھر ضد کر کے اپنے دادا کے ساتھ کہانی سنتے سنتے لپٹ کر سو گیا تھا۔ اکرم نے بیٹے کو اُٹھا کر شانے سے لگا لیا ''یہ آج پھر یہیں سو گیا......؟......سکینہ کے پاس ڈال آتے اسے......ساری رات تمہیں تنگ کرے گا......''اعظم نے دھیرے سے کہا''تنگ تو تو نے بھی مجھے بہت کیا ہے بچپن میں......آج پھر اتنی دیر سے گھر لوٹا ہے تو......''اکرم بات ٹال گیا۔ دوستوں کے ساتھ دیر ہو گئی......کام مل گیا ہے......کل سے کام پر جاؤں گا''......اعظم نے ہاتھ اُٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اگلی صبح سکینہ کے میکے سے بلاوا آ گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی کی شادی کی تیاریاں جاری تھیں لیکن گڈو نے ماں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کے دادا نے چودہ اگست کی صبح اُسے رنگ برنگی جھنڈیوں والے میدان میں میلہ دکھانے لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ ہر سال آزادی کے دن ان کے چھوٹے سے شہر کے باہر بڑے میدان میں میلہ لگتا تھا اور بڑے بڑے لوگ وہاں آ کر تقریریں کرتے تھے۔ گڈو تو جانے کتنے مہینوں سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا لہٰذا ماں کو مجبوراً اکیلے ہی میکے جانا پڑا۔

مغرب کے وقت اکرم دوبارہ اُسی گلی میں جا پہنچا جہاں اُسے گزشتہ رات اجنبی نے آنے کا کہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرے نے پھر سے ایک بھرپور دن کو مکمل شکست دے دی۔ لیکن آج اکرم کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اجنبی جلد ہی ایک موٹر سائیکل پر سوار وہاں آ پہنچا۔ شہر بھر میں جشن آزادی کی تیاریاں اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہو چکی تھیں لیکن ڈبل سواری پر ابھی تک پابندی برقرار تھی۔ اجنبی نے موٹر سائیکل اکرم کے حوالے کی''یہ لو......خیال سے چلانا......ریڈی ایٹر والی جگہ پر فلٹر کے خانے میں طاقتور بم نصب ہے۔ زیادہ چھیڑ چھاڑ نہ کرنا......ورنہ ٹائمر رک جائے گا تو وہیں اڑ جاؤ گے......کل صبح بڑے میدان کے جلسے میں اسے

کسی ایسی جگہ کھڑا کرنا جہاں آس پاس بھیڑ زیادہ ہو..... دھماکہ ہوتے ہی تمہاری رقم تمہاری جیب میں ہوگی..... لیکن دھیان رہے..... کام بڑی ہوشیاری سے کرنا ہے..... وہاں کافی چیکنگ ہوگی صبح..... کسی کے ہتھے نہ چڑھ جانا..... ورنہ ساری عمر جیل میں سڑتے رہو گے.....'' اکرم نے کچھ کہے بنا موٹر سائیکل اجنبی سے لے لی اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ راستے میں آتے ہلکے پھلکے گڑھے اور سپیڈ بریکر جنہیں وہ عام حالات میں کسی خاطر میں نہیں لاتا تھا آج اس کی جان کا عذاب بنے ہوئے تھے۔ ایک معمولی کنکر بھی اگر ٹائر کے نیچے آجاتا تو اکرم کا دل اُچھل کر حلق میں آجاتا اور اس کی کن پٹیوں سے پسینے کی دھاریں بہہ نکلتیں۔ آج گھر کا راستہ بھی کس قدر طویل ہوگیا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ اپنی گلی تک پہنچا تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ دروازے سے کچھ پہلے وہ موٹر سائیکل کو بند کر کے نیچے اُتر گیا اور موٹر سائیکل کو دھکیلتے ہوئے اپنے گھر کے صحن میں داخل ہوا۔ اعظم اور گڈو کھانا کھا رہے تھے وہ صحن میں بچھی دوسری چارپائی پر ان کے قریب بیٹھ گیا۔ اعظم نے بیٹے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ''یہ موٹر سائیکل کس کی اٹھا لائے ہو.....'' اکرم نے بظاہر لاپرواہی سے جواب دیا ''شوکی کی ہے..... پٹرول ختم ہوگیا تھا راستے میں..... کہہ رہا تھا کہ کل آکر لے جاؤں گا..... اب رات کو اسے کہاں گھسیٹتا پھروں گا.....'' شوکی اکرم کا لنگوٹیا تھا اور اکثر دونوں دوست ایک دوسرے کی اشیاء استعمال کرتے رہتے تھے۔ گڈو نے صحن میں نئی موٹر بائیک کھڑی دیکھی تو اس کا دل مچلنے لگا اور کسی نہ کسی بہانے سے بائیک کے گرد پھرکی کی طرح طواف کرنے لگا۔ اکرم نے اسے بائیک کے قریب جاتے دیکھا تو زور سے چلایا ''خبردار..... جو اسے ہاتھ بھی لگایا..... ابھی کل ہی شوکی نے لی ہے..... کہتا تھا ہزار پانچ سو زیادہ ملے تو آگے بیچ دوں گا..... لیکن اگر تو نے گاڑی پر کوئی خراش ڈال دی تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا..... لہٰذا دور ہی رہنا..... چل جا کر اپنے دادا ابا کے ساتھ سو جا''..... گڈو کچھ دیر وہیں صحن میں کھڑا منہ بسورتا رہا۔ اعظم جو صحن کے کونے میں لگے نلکے کے نیچے ہاتھ دھو رہا تھا اس نے اکرم کو ڈانٹا۔ ''کتنی مرتبہ کہا ہے کہ میرے گڈو کو نہ ڈانٹا کر..... کچھ دیر کے لیے سیٹ پر بیٹھ جائے گا تو تیرے دوست کی یہ پھٹیچر گھس تو نہیں جائے گی.....'' اعظم نے پوتے کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر موٹر سائیکل کی سیٹ پر بیٹھا دیا اور اکرم کی جان نکل گئی۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے باپ کو وہاں سے ہٹا دیا۔ ''بچے کی ہر ضد پوری نہیں کرتے..... تم ہٹو..... میں اسے باہر سے چاکلیٹ دلا دیتا ہوں.....'' گڈو نے ہینڈل کو مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا لیکن اکرم نے ایک جھٹکے سے بیٹے کے ہاتھ چھڑا دیئے اور تقریباً گھسیٹتا ہوا اسے صحن سے باہر لے گیا۔ اعظم حیرت سے اکرم کی یہ پتھر دلی دیکھتا رہا اور بڑبڑایا ''جلاد کہیں کا.....'' اعظم نے کھنکارتے ہوئے اپنی جیب سے تسبیح نکالی اور صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹ کر زیر لب تسبیح پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اکرم گڈو کا ہاتھ تھامے دوبارہ گھر میں داخل ہوا اور گڈو لپک کر اپنے دادا کے پہلو میں جا پہنچا اور اُسے اکرم کی دلائی ہوئی چیزیں دکھانے لگا۔ اعظم گڈو کے

ہاتھوں میں چاکلیٹ اور بسکٹ کے بہت سے پیکٹوں سمیت چند کھلونے دیکھ کر چونک سا گیا''اکو   تو نے پھر کسی سے قرض پکڑ لیا ہے ... کہاں سے آئے تیرے پاس اتنے پیسے ...؟''اکرم جواب تک دوسری چار پائی پر لیٹ کر آنکھیں موندھ چکا تھا اس نے بے زاری سے کروٹ بدلی۔''تجھے بتایا تو تھا ... کام مل گیا ہے مجھے.....اُس کی پیشگی ملی تھی آج..... قرض نہیں لیا کسی سے.....''اعظم نے حیرت سے پوتے کے ہاتھوں میں پکڑے تھیلوں کو دیکھا اور خود سے بولا''ایسا کون سا کام مل گیا ہے اسے کہ جس کی پیشگی ہی اتنی بھاری ہے....''اعظم کے دل میں شک کے سنپولیے نے سر ابھارا لیکن جب تک وہ اگلے سوال کے لیے بیٹے کی طرف پلٹا تب تک اکرم کروٹ پلٹ کر چہرہ موڑ چکا تھا لیکن سونے کا دکھاوا کرنے والے اکرم کی آنکھوں سے نیند اب بھی کوسوں دور تھی۔اس کا سارا دھیان سامنے کچھ فاصلے پر کھڑی موٹر سائیکل کی طرف تھا جس کے فلٹر کے ڈبے میں سینکڑوں لوگوں کی چھپی موت گھڑی کی ٹائمر کی ٹک ٹک سے لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اچانک بے خیالی میں اُس کی نظر اپنی چھت پر لگے پاکستان کے جھنڈے پر پڑی۔گڈو نے اپنے دادا سے ضد کر کے یہ جھنڈا آج ہی گلی کے نکڑ پر پھیری والے سے خریدا تھا جو پہلی اگست سے روزانہ ایسے بہت سے ننھے منے جھنڈے اور جھنڈیاں بیچنے کے لیے ان کی گلی میں آرہا تھا۔محلے کے سبھی بچے یہ جھنڈے خرید کر اپنے گھروں کی چھتوں پر لہراتے اور گلی اور صحن میں جھنڈے کے نشان والی سبز جھنڈیاں سجا کر فخر سے ایک دوسرے کو دکھایا کرتے تھے۔اکرم کو یاد آیا کہ وہ بھی بچپن میں ایسے جھنڈے اُٹھا کر گلیوں میں دوڑتا اور سب دوستوں کے ساتھ مل کر زور زور سے نعرے لگایا کرتا تھا۔''جیوے جیوے ... جیوے پاکستان.....''

ان یادوں سے گھبرا کر اکرم نے آنکھیں موند لیں۔لیکن آنکھیں بند کر لینے سے بھلا یادیں کب پیچھا چھوڑتی ہیں۔ بلکہ بعض تلخ یادیں تو شاید ہماری پلکوں کے پردے تلے ہی اس انتظار میں چھپی بیٹھی ہوتی ہیں کہ کب ہم پلکیں موندھیں اور کب وہ ہم پر حملہ آور ہوں۔اکرم بھی ایسی ہی کچھ یادوں کے بھنور میں غوطے کھا رہا تھا کہ اچانک کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر یہ دیکھ کر اس کا دم نکلتے نکلتے رہ گیا کہ گڈو سوتے ہوئے دادا سے نظر بچا کر دوبارہ موٹر سائیکل کے قریب پہنچ کر اس کے مختلف حصوں کو چھو کر دیکھ رہا ہے۔ایک نئی چمکتی دمکتی موٹر سائیکل نے اس کے اندر کے بچے کو مچا رکھا تھا اور گڈو چاروں جانب گھوم پھر کر موٹر سائیکل کے پچھلے پہیے کو گھما کر اور اس کی گدی کو تھپتھپا کر اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔اگلے ہی لمحے اکرم بجلی کی تیزی کے ساتھ گڈو کے سر پر پہنچ چکا تھا اور اس نے بنا کچھ کہے اپنے معصوم بیٹے کے گال پر ایک زوردار چانٹا جڑ دیا۔''تجھے منع کیا تھا ناں.....کہ اس عذاب کو ہاتھ نہ لگانا ... بات سمجھ نہیں آتی تجھے ...''گڈو زور سے رو پڑا۔اعظم پوتے کی آواز سن کر ہڑبڑا کر جاگ گیا''کیا ہوا.....؟.....سب خیر تو ہے ...''گڈو بھاگ کر دادا سے لپٹ گیا اور زور زور سے رونے لگا۔''ابا نے تھپڑ مارا ہے.....''اعظم نے پوتے کے گال پر چاروں انگلیوں کا

تازہ سرخ نشان دیکھا تو اس کا پارہ چڑھ گیا ”تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ... یہ کیا پاگل پن سوار ہو گیا ہے تجھ پر؟..... اٹھا اپنے دوست کی یہ پھٹ پھٹی اور ابھی لے کر نکل جا یہاں سے ..... بچے نے ذرا سا ہاتھ کیا لگا دیا تو نے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے..... آخر ایسے کون سے ہیرے جڑے ہیں اس موٹر سائیکل کے اندر .....؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں.....“ اعظم اُٹھ کر موٹر سائیکل کے پاس پہنچ گیا اور اشتعال میں اُسے ایک زوردار لات رسید کر بیٹھا۔ موٹر سائیکل دھکے سے فضا میں تھوڑا سا جھولی اور اکرم نے برق سرعت سے اُسے گرنے سے پہلے ہی تھام لیا۔ ”دیکھ ابا..... اسے ہاتھ نہ لگا..... ورنہ برا ہو جائے گا.....“ اعظم بیٹے کی بات سن کر مزید طیش میں آ گیا ”کیوں..... کیوں نہ لگاؤں اسے ہاتھ..... تو نے اس میں کوئی خزانہ چھپا رکھا ہے ... جب سے گھر واپس آیا ہے چوروں کی طرح بول رہا ہے..... سچ بتا..... کیا معاملہ ہے..... موٹر سائیکل چوری کی ہے یا کسی واردات میں لوٹے پیسے اس کے کسی حصے میں دبا رکھے ہیں تو نے ...“ اعظم نے دوبارہ ٹٹولنے کی کوشش کی۔ اکرم نے باپ کو زور سے جھڑکا ”نہ میں نے چوری کی ہے اور نہ کوئی واردات ..... بس اب پیچھا چھوڑ دے میرا.....“ اچانک اعظم کی نظر موٹر سائیکل کی ٹینکی سے نکلتے پتلے سے پائپ پر پڑی جو اس کی لات لگنے سے شاید اپنے مرکز سے نکل گیا تھا اور اب ہوا میں جھول رہا تھا۔ پائپ میں سے پٹرول کی پتلی سے دھار نکل کر صحن کی کچی زمین میں جذب ہو رہی تھی اور فضا میں پٹرول کی تیز بو پھیل چکی تھی۔ اعظم چونکا ”تو نے تو کہا تھا کہ اس کا پٹرول ختم ہو گیا ہے اس لیے شوکی اسے یہیں چھوڑ گیا..... پر یہ تو پٹرول سے بھری ہوئی ہے..... تو نے جھوٹ کیوں بولا اکو..... سیدھی طرح بتاتا ہے یا میں تیلی لگا کر ابھی اس پھٹ پٹھیا کو جلا کر خاک کر ڈالوں“..... اکرم نے صحن میں سہمے سے کھڑے گڈو کو ڈپٹ کر اندر بھیج دیا ”تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے..... جا جا کر اپنی ماں کے کمرے میں سو جا..... اور خبردار جو صبح سے پہلے باہر نکلا تو..... چل بھاگ یہاں سے.....“ گڈو باپ کی ڈانٹ سن کر اندر کمرے کی جانب دوڑ گیا۔ اکرم اپنے باپ کی طرف پلٹا ”ابا..... تیرے لیے یہی بہتر ہو گا کہ میرے معاملے میں ٹانگ نہ اڑا..... میں نے کوئی چوری نہیں کی..... بس اپنا حق مانگا ہے زمانے سے.....“ اعظم مزید مشکوک ہو گیا ”کیسا حق ..... اور اس موٹر سائیکل میں تو نے ایسا کیا چھپا رکھا ہے کہ ذرا سا ہاتھ لگنے پر تو بدک جاتا ہے..... مجھے دیکھنے دے.....“ اعظم آگے بڑھا لیکن اکرم نے اسے دھکے سے دور کر دیا ”نہیں ابا..... اسے ہاتھ نہ لگانا.....“ لیکن اعظم نے بھی ٹھان لی تھی اور وہ بیٹے سے گتھم گتھا ہو گیا۔ ”میں بھی دیکھ کر رہوں گا، ہٹ جا میرے آگے سے اکو.....“ دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کو دھکیلتے اور گرانے کی کوشش میں پورے صحن میں چکر کھا رہے تھے۔ اکرم کی پوری خواہش تھی کہ باپ کو موٹر سائیکل سے دور رکھ سکے۔ مگر اعظم کی بوڑھی ہڈیوں میں اب بھی ایک جلاد کی طاقت موجود تھی۔ نتیجہ اس نے لمبی دھینگا مشتی کے بعد بیٹے کو پچھاڑ کر زمین پر گرا دیا اور موٹر سائیکل کی جانب لپکا۔ اکرم چلایا ”اسے ہاتھ نہ لگانا ابا..... اس میں بم لگا ہوا ہے.....“ اعظم جو بالکل

قریب پہنچ چکا تھا زمین میں گڑ کر رہ گیا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو..... کیسا بم.....“ اکرم زمین سے کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں نے کل کے جلسے میں اس موٹر سائیکل کو پہنچانے کے پیسے لے رکھے ہیں.....اور اب کوئی بھی مجھے اس کام سے نہیں روک سکتا.....“ اعظم کے سر پر جیسے خود ایک بڑا سا بم پھوٹ چکا تھا۔ ”تو نے دہشت گردی مچانے کے لیے پیسے لیے ہیں لعنت ہو تجھ پر اکو.....تو نے آزادی والے دن اپنی قوم والوں کو مارنے کا منصوبہ بنایا ہے..... تیرا ابا گھر کی چھت پر جھنڈے سجا رہا ہے اور قومی ترانے گاتا پھرتا ہے.....اور تو.....“ اکرم باپ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زور سے چلایا ”یہ جھنڈا اور یہ آزادی کا دن میرا اور تیرا پیٹ نہیں بھر سکتے ابا..... یہ سب بھرے پیٹ کی عیاشیاں ہیں..... جب میرا پیٹ بھرا ہوگا تو میں بھی جشن آزادی مناؤں گا..... اور کیا دیا ہے آج تک اس بے کار کی سوچ نے ہمیں؟..... تو تیس سال کی نوکری میں اپنے لیے ایک چھت نہ بنا سکا اور آج بھی کرائے کے گھر میں پڑا ہے..... کیا ملا تجھے یہ ایمان داری اور نیکی کی زندگی گزار کر..... خود اپنی بیماری کے لیے مہنگی دوا تک نہیں خرید سکتا..... تیرے ساتھ ریٹائر ہونے والے اس جیل کے کلرک نے چار سو گز پر اپنی کوٹھی ڈالی ہے..... وہ بھی تو تیری طرح گریڈ پانچ کا ملازم تھا ابا..... آج اس کی اور اس کی اولاد کی زمانے میں بڑی عزت ہے.....اور ایک ہم ہیں..... ساری عمر یوں ہی جلتے کڑھتے اور سڑتے رہ گئے..... مجھے کچھ کما لینے دے ابا.....بس ایک بار یہ کڑوا گھونٹ پی لے..... پھر اس کے بعد ساری زندگی تیری طرح کی زندگی گزار دوں گا..... قسم لے لے مجھ سے.....“ اعظم دکھ سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے تو عمر بھر تجھے حلال کا نوالہ کھلایا تھا اکو..... پھر تیرے خون میں یہ شیطان کیسے بولنے لگا.....؟ کہاں غلطی ہوگئی مجھ سے.....؟..... اس کمائی سے تو بہتر ہے کہ تو معذور ہو جائے اور میں ساری عمر تیرا اور تیرے بچوں کا پیٹ خود پالوں..... میں تجھے ایسی کوئی حرکت نہیں کرنے دوں گا..... جا..... جا کر یہ موٹر سائیکل کسی ویرانے میں کھڑی کر دے اور پولیس والوں سے کہہ دے کہ وہ آ کر اسے ضبط کر لیں..... یوں تیرا نام بھی نہیں آئے گا اور تو ایک بڑے گناہ کبیرہ سے بھی بچ جائے گا..... جا میرا بیٹا..... باپ کی بات مان لے..... یہ پیسے نہیں جہنم کی آگ ہے جسے تو اپنی جیب میں لیے پھر رہا ہے.....“ اکرم غصے میں زور سے چیخا ”نہیں میں یہ موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا..... تجھے اگر ان پیسوں کا اتنا ہی خوف ہے تو میں تیس اور جا کر بس جاؤں گا..... مگر میں یہ کام کر کے لاکھوں ضرور کماؤں گا..... ابا تو نے خواب میں بھی پورے لاکھ روپے دیکھے ہیں..... تیری ساری زندگی کی کمائی سے بھی زیادہ ہوں گے..... بس اب تو میرے راستے میں نہ آنا..... صبح ہونے والی ہے..... میں یہ موٹر سائیکل لے کر جاتا ہوں..... دور کہیں سے فجر کی اذانوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اعظم نے بیٹے کو موٹر سائیکل کی طرف بڑھتے دیکھا تو زور سے چلایا ”خبردار اکو..... میرے اندر کے جلاد کو جگانے کی کوشش نہ کر پتر..... جیسا میں کہتا ہوں..... جا کر ویسا ہی کر..... ورنہ میں تجھے یہ موٹر سائیکل یہاں سے

لے جانے نہیں دوں گا..... اور اب میں تجھے اسے لیے بھی نہیں بھیجوں گا.....چل دونوں باپ بیٹا اسے کسی ویرانے میں چھوڑ آتے ہیں ..... میری بات مان جا اکرم.....'' لیکن اکرم کہاں سننے والا تھا۔ اس نے بوڑھے اور ضدی باپ کو ایک زوردار دھکا دیا اور خود بائیک کی جانب لپکا۔ اعظم کا سر صحن میں پڑی چارپائی کے پائے سے ٹکرایا اور خون کی ایک تیز دھار اس کے چہرے کو بھگو گئی۔ اکرم تب تک موٹر سائیکل کو اسٹینڈ سے اتار چکا تھا اور دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا اعظم کا ہاتھ اپنے تکیے کے نیچے سرک گیا اور وہ زور سے چلایا ''رک جا اکو'' لیکن اکرم نے پلٹ کر باپ کی جانب نہیں دیکھا اور گلی میں کھلتا صحن کا بیرونی دروازہ کھول کر موٹر سائیکل کو باہر کی جانب دھکیلا۔ دفعتاً فضا میں سرکاری ریوالور کے ایک زوردار فائر کی آواز گونجی اور اکرم اوندھے منہ وہیں آدھا صحن اور آدھا گلی میں گر پڑا.....اسکے جسم سے نکلتی خون کی دھار گلی میں بہتی نالی تک جا پہنچی اور موٹر سائیکل اسکے ہاتھ سے چھوٹنے کے بعد صحن کے دروازے سے ٹکی یوں کھڑی رہ گئی کہ اس کا اگلا پہیہ گلی میں اور پچھلا پہیہ ابھی تک گھر کے صحن میں اٹکا ہوا تھا اعظم کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور سے ہلکا سے دھواں اٹھ کر اس کی بھیگی پلکوں کو مزید سلگا رہا تھا۔ اور گھر کی چھت پر لگا پاکستان کا جھنڈا صبح کی تیز ہوا سے پھڑ پھڑائے جا رہا تھا۔



جان نشین (افسانہ)

اسپین کے شہر بارسلونا کی وہ سہ پہر بھی حسب معمول روشن اور چمکیلی تھی۔ آسمان پر چند آوارہ بادل دھوپ کی شہزادی کا راستہ کاٹنے کی کوشش میں مگن تھے۔ مگر شہزادیاں ایسے خانہ بدوش آوارہ گردوں کی باتوں میں بھلا کب آتی ہیں؟ بھینسے کی لڑائی والا اکھاڑا تماشائیوں سے کچھا کھچ بھر چکا تھا۔ اب اس دس ہزار نشستوں کی گنجائش والے ایرینا (Arena) میں تل دھرنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ گول اکھاڑے کے درمیانی راستے جہاں نمکین گرم مونگ پھلیاں اور بھنے ہوئے دانے بیچنے والے لڑکے آوازے لگاتے تھے۔ وہاں بھی تماشائیوں کا قبضہ تھا اور ٹھنڈی بوتلیں اور آئس کریم کے تھرماس والے ہاکر ہجوم میں گھرے کھڑے وہیں دور سے اپنا مال بیچ رہے تھے۔ آج وہاں ان کے ہر دل عزیز لڑاکا (Bull Fighter) انتونیو کا اس اکھاڑے کے سب سے خطرناک بھینسے کلر (Killer) کے ساتھ آخری مقابلہ تھا۔ اس مقابلے کے بعد انتونیو ہمیشہ کے لیے بل فائٹنگ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کرنے والا تھا۔ انتونیو نے اس اکھاڑے میں لڑی جانے والی ہر جنگ جیتی تھی مگر اس لڑاکا بیل کلر نے بھی کبھی کسی مقابل کو اپنے سینگوں سے زندہ بچ کر واپس گھر نہیں جانے دیا تھا۔ لیکن اتفاق سے اپنے وقت کے یہ دونوں بہترین لڑاکا کبھی ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئے تھے۔ سنا تھا کہ اکھاڑے کی انتظامیہ کلر کو بھی اس مقابلے کے بعد مزید لڑنے سے دست بردار کروا رہی تھی کیونکہ کلر بھی اپنے لڑنے کی طبعی مدت پوری کر چکا تھا اور انتظامیہ اس شاندار لڑاکا جانباز کو ذلت کی موت سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا طے یہ پایا تھا کہ اگر آج کے مقابلے کے بعد کلر انتونیو کی تلوار سے بچ گیا تو اسے پورے اعزاز کے ساتھ ریٹائرڈ جانوروں کے فارم ہاؤس بھجوا دیا جائے گا۔ شاید اسی وجہ سے پورا بارسلونا شہر یہ آخری

مقابلہ دیکھنے کے لیے اس ''بندارس'' نامی بل فائٹنگ کے اکھاڑے میں جمع ہو چکا تھا۔ایک جانب انتونیو اپنے لباس کا آخری جائزہ لے رہا تھا اور اپنی تلوار کی دھار کو چھو کر اس کی کاٹ جانچ رہا تھا تو دوسری جانب کلر بند اندھیرے کمرے میں سر جھکائے کھڑا اپنے کھروں سے اکھاڑے کی ریتلی زمین کو کھرچ رہا تھا۔شاید اس وقت ان دونوں لڑاکوں کے ذہن میں کچھ ایک جیسے ہی خیالات جنم لے رہے تھے۔وہ دونوں جانتے تھے کہ اب وہ بوڑھے ہونے کو ہیں اور شاید یہ ان دونوں کی زندگی کا آخری کھیل ہو۔بل فائیٹنگ میں بڑھاپا عمر سے بہت پہلے آجاتا ہے اور کبھی کبھی تو تیس پینتیس سال کی عمر میں ہی فائٹرز کو یہ کھیل خیرآباد کہنا پڑتا ہے کیونکہ بھینسے کی لڑائی دونوں جانب سے بیدار اعصاب اور تیز حسیات کا مقابلہ ہوتا ہے۔اور کسی بھی ایک مقابل کی ذرا سی لمحاتی چوک دونوں میں سے کسی ایک کی زندگی کا خاتمہ ثابت ہوسکتی ہے۔

یہ ان دونوں مدمقابل آنے والوں کے اعصاب کی بھی آخری لڑائی تھی اور شاید دونوں نے اپنے یہ اعصاب اس آخری جنگ کے لیے ہی بچا رکھے تھے۔انتونیو نے اپنی سیاہ مخملی پوشاک کے سنہری بٹن بند کیے اور گھٹنوں تک لمبے مخصوص سیاہ جوتوں کے تسموں کو آخری گرہ لگائی۔باہر اکھاڑے میں تماشائیوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔کلر بھینسے نے چونک کر گردن اٹھائی اور لکڑی کے تختوں کی درز سے باہر جھانکنے کی کوشش کی وہ اب تک کئی بل فائٹرز کو اپنے مضبوط، نوکیلے اور جاندار سینگوں پر اچھال کر عمر بھر کے لیے معذور کر چکا تھا۔اور اس کا سارا جسم فائیٹرز کی تیز دھار تلواروں کے زخموں کے نشان سے بھرا ہوا تھا۔ان میں سے کچھ زخم ایسے بھی تھے جنہیں بھرنے میں مہینوں لگے تھے مگر کلر ہر زخم کے بعد ایک نئے جوش ولولے اور غصے کے ساتھ دوبارہ اکھاڑے میں اُترا تھا۔اُسے سرخ چادر لہراتا وہ سیاہ پوش ہمیشہ ایک ہدف کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ایک ایسا قاتل ہدف جو اپنے ہاتھوں میں اپنی سرخ موت کو جھٹکے دے کر لہرا رہا ہو۔اور اب تک کلر اتنا جان چکا تھا کہ قصور اس مچلتے لہراتے سرخ لہو رنگ کپڑے کا نہیں بلکہ اُس کے پیچھے کھڑے اس دشمن کا ہے جو موقع پاتے ہی اپنی تیز دھار نوکیلی تلوار اس کی دو آنکھوں کے درمیان موجود نرم جلد میں گھونپ کر ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کرنے کی تاک میں ہوتا ہے۔لہٰذا کلر کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ پہلے جھٹکے میں ہی سرخ کپڑے کے پیچھے چھپے اس قاتل کا جسم اپنے سینگوں سے ادھیڑ کر رکھ دے۔ڈریسنگ روم میں تیار ہوتے انتونیو نے سرخ چادر لہرا کر دیکھی۔اس سرخ مخمل کی آڑ میں ہی آج اُسے اپنا سوواں شکار کرنا تھا۔آج سے پہلے وہ ننانوے مد مقابلوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا مگر اس کے گھائل جسم پر پڑے زخموں کی تعداد ننانوے سے کہیں زیادہ تھی۔آج وہ اپنی سینکڑہ مکمل کر کے اس کھیل میں میں امر ہو جانا چاہتا تھا۔تماشائیوں میں بیٹھی اس کی بیوی ...یا نے بے چینی سے اپنے سیاہ جالی دار نقاب کے پیچھے سے اپنے ہاتھ میں پکڑی سرخ گلاب کی کلی کو دیکھا۔ انتونیو اس کا شوہر ہی نہیں اُس کا محبوب بھی تھا۔آج سے دس برس قبل اس نے انتونیو کو ایسے ہی ایک

اکھاڑے میں دیکھ کر پہلی مرتبہ اس کی جانب گلاب کی سرخ کلی اُچھالی تھی۔ تب وہ بھی شعلہ جوان تھی اور سیاہ لباس اور سیاہ سکارف میں ہلکے جالی دار نقاب کے ساتھ جب وہ اسپین کے کسی بازار سے گزرتی تو دل جلے گھنٹوں اپنا سینہ تھامے وہیں بیٹھے رہ جاتے تھے۔ یہ لباس وہ خاص اسی دن پہنا کرتی تھی جب اسے کوئی بل فائٹنگ کا مقابلہ دیکھنے کے لیے جانا ہوتا تھا۔ اور انتونیو نے بھی شادی سے قبل پہلی مرتبہ ماریا کو اسی لباس میں تماشائیوں کی بھیڑ میں بیٹھے دیکھ کر اپنا دل اس کے قدموں میں ہار دیا تھا۔ اب ان کا ایک نو سالہ بیٹا رومیرو بھی اس زندگی کے سفر میں دونوں کا ساتھی تھا لیکن ماریا کبھی اُسے اپنے باپ کا مقابلہ دکھانے کے لیے اکھاڑے میں اپنے ساتھ نہیں لاتی تھی۔ جو کھیل اُسے اس کے محبوب اور شوہر سے ملانے کا باعث بنا تھا اور جس کی وہ اتنی دیوانی تھی کہ ہزاروں کی رقم خرچ کر کے بھی وہ ہر حال میں مقابلہ دیکھنے آتی تھی اب وہی کھیل اُس کی وحشت کا باعث تھا۔ جب بھی کوئی بھینسا انتونیو کے جسم پر اپنے نوکیلے اور خونخوار سینگوں سے کوئی خون آلودہ خراش ڈالتا تو ماریا کا دل اُچھل کر حلق میں آجاتا تھا۔ آج اس کا محبوب اپنی زندگی کا آخری کھیل کھیلنے کے لیے اس اکھاڑے میں اترنے والا تھا۔ جہاں ایک طرف یہ ماریا کے لیے اطمینان کی بات تھی وہیں اُس کلر نامی بھینسے کی خون خواری اور بربریت کے قصے بھی اُسے پریشان کر رہے تھے کیونکہ اس کے انتونیو کی طرح کلر بھی آج تک کوئی مقابلہ نہیں ہارا تھا۔

وہاں بند تاریک کمرے میں کھڑے کلر نے زور سے اپنے نتھنوں کو سکیڑ کر ایک پھنکار نما سانس لی۔ اُسے مزید وحشی کرنے کے لیے گزشتہ تین دنوں سے بہت کم خوراک کھلائی جا رہی تھی تاکہ اس پر بھرے پیٹ کی سستی طاری نہ ہو سکے۔ کلر جانتا تھا کہ آج ایک بار پھر جب وہ اپنے مقابل کا جسم ادھیڑ کر واپس اپنی آرام گاہ میں آئے گا تو حسب معمول اسے پیٹ بھر کھانا اور خوب سیر ہو کر پینے کو پانی اور شراب بھی ملے گی لہٰذا وہ اس مقابلے کا جلد از جلد آغاز چاہتا تھا کیونکہ اختتام پھر اس کے اپنے ہاتھوں ہی ہوتا تھا۔ کلر نے بے چینی سے اپنے سینگ لکڑی کے مضبوط تختوں والی دیوار کے ساتھ رگڑے...... اندھیرے میں چند چنگاریاں اُچھل کر بجھ گئیں۔

انتونیو سر پر مخصوص پروالا ترچھا ہیٹ سجا کر اکھاڑے میں داخل ہوا تو چاروں جانب تیز سیٹیوں اور نعروں کا شور مچ گیا۔ اس نے ہیٹ اتار کر اور سر کو جھکا کر چاروں طرف کے تماشائیوں کو سلام پیش کیا اور اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی نظر تیسری قطار میں بیٹھی ماریا پر پڑی جو اُسی کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ ماریا آج بھی رومیرو کو اپنے ساتھ نہیں لائی تھی۔ انتونیو رومیرو کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا مگر ماریا اس بات پر راضی نہیں تھی۔ انتونیو کو لگتا تھا کہ یہ فن اس کے ساتھ ہی ان کے خاندان سے ختم ہو جائے گا حالانکہ اس کے آباؤ اجداد بھی بل فائٹر رہ چکے تھے لیکن یہ سلسلہ آج اختتام پذیر ہونے کو تھا۔ انتونیو نے سوچ رکھا تھا کہ وہ مناسب وقت آنے پر اس بارے میں ماریا سے بات ضرور کرے گا۔ وہاں دوسری جانب اکھاڑے کی انتظامیہ بھی اس بات

سے پریشان تھی کہ بندارس (Bendras) نامی اکھاڑے کو لاکھوں کما کے دینے والا بھینسا کلر بنا کسی جان نشین کے آج اکھاڑہ چھوڑ جائے گا۔ کلر جیسا لوہے کا جسم رکھنے والا بل عشروں بعد جا کر پیدا ہوتا ہے مگر بدقسمتی سے کلر کے بعد اس کا کوئی جان نشین بندارس کے اکھاڑے کے پاس نہیں تھا۔

انتونیو نے تماشائیوں سے اجازت طلب کر کے سامنے تختوں والے کمرے کے دو رکھوالوں کو کمرے کے دروازے پر لگی لوہے کی رکاوٹ کو ہٹانے کا اشارہ کر دیا۔ کلر نے یک دم روشنی ہو جانے پر چونک کر غصے میں سر اٹھایا۔ اسکے ٹھیک عین سامنے پانچ سو گز کی دوری پر اس کا حریف ہاتھ میں سرخ کپڑا لیے کھڑا تھا۔ کلر نے پھنکار کر اپنے کھروں سے زمین کو کھرچا اور اپنا جسم حملے کے لیے تولا۔ دوسری جانب کھڑے انتونیو نے دروازہ کھلنے کے بعد کلر کو غصے سے اپنی جانب گھورتے دیکھا تو اس نے اپنی سرخ چادر کو زور سے حرکت دی۔ یہ گویا دشمن کو حملے کی دعوت تھی۔ بھینسے نے ایک زقند بھری اور وہ کھلے میدان میں آ گیا۔ تماشائیوں کے شور نے آسمان سر پر اٹھا لیا لیکن کلر کی تمام توجہ اپنے ہدف پر تھی۔ اس نے غصے میں کھڑے کھڑے ایک چکر کاٹا اور پھر بے تحاشہ اپنے حریف کی طرف دوڑا۔ انتونیو کا جسم تن گیا اور اس نے جسم سے کچھ سینٹی میٹرز کے فاصلے پر چادر پکڑ کر دشمن کو حملے کا اشارہ دیا۔ ماریا نے پریشانی میں اپنی انگلیاں چٹخائیں۔ بھینسا انتونیو کے جسم کو مس کرتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔ اگر انتونیو ہوشیار نہ ہوتا تو ضرور اس کے قدم اکھڑ جاتے کلر اپنے زور میں بہت آگے بڑھ چکا تھا اسنے خود کو روکا اور تیزی سے پلٹا تب تک انتونیو بھی پلٹ کر دوبارہ حملے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔ بل فائٹنگ کے کھیل کے اصول کے مطابق انتونیو کو پہلے بھینسے کو ستا کر اور بھگا کر تھکن سے ادھ موا کرنا تھا اور پھر اس کے بعد تماشائیوں کی اجازت سے بھینسے کے سر میں اپنی تلوار گاڑ دینی تھی۔ لیکن آج اس کا حریف تھکنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا ہر حملہ پہلے سے کہیں زیادہ شدید اور جان لیوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسا وہ جانور انسانی دماغ پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اب تک وہ ہر طرح سے انتونیو کو اپنے سینگوں سے چھلنی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انتونیو کے جسم پر کئی خراشیں ڈال چکا تھا۔ لیکن انتونیو اب بھی پورے اطمینان سے اپنے دشمن کا ہر حملہ ناکام بنا رہا تھا اسکے ہاتھوں میں پکڑی سرخ چادر دھیرے دھیرے چیتھڑوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ انتظامیہ کی اجازت کے بغیر یہ کھیل ختم نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ بھینسے کے سر میں تلوار گھونپنے سے قبل اُسے تماشائیوں کو جی بھر کر سنسنی اور تفریح کا لطف لینے دینا تھا۔ تماشائی بھی رفتہ رفتہ جنونی ہوتے جا رہے تھے۔ اب انتونیو نے ایک ہاتھ میں پکڑی تلوار کے ساتھ کلر کے جسم پر ہلکی پھلکی خراشیں ڈالنا بھی شروع کر دی تھیں اور ہر بار خون کی دھار اچھلنے پر تماشائیوں کے اندر کا جانور خوشی سے چیخیں مارتا اور بھینسا مزید غضب ناک ہوا جاتا تھا۔ اسی اثناء میں ایک بار انتونیو کو جھکائی دینے میں ذرا سی تاخیر ہو گئی اور کلر کے تیز دھار سینگ نے اس کے پہلو میں مرچیں سی بھر دیں۔ انتونیو

نے اپنی سیاہ جیکٹ کو چھوا تو وہ خون میں تر بتر تھی۔ کلر نے پلٹ کر انتونیو پر ایک ایسی نظر ڈالی جیسے اس سے کہہ رہا ہو۔۔۔ ''کہو۔۔۔ مزہ آیا دشمن۔۔۔'' ماریا کے ہاتھ سے کلی گر گئی اور وہ زور سے چلائی ''یہ دیوانگی ہے۔۔۔ اب اس وحشی کو ختم کر دو انتونیو'' تماشائی بھی چیخنے لگے۔۔۔ ''ہاں ہاں۔۔۔ ختم کر دو۔۔۔ اب اس کے ماتھے میں آنکھوں کے عین درمیان اپنی تیز تلوار گھونپ دو۔۔۔ قتل کر دو اسے۔۔۔'' انتونیو اور کلر دونوں کا جسم رفتہ رفتہ تھکن اور زخموں سے چور ہو رہا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ اب آخری لمحات ہیں اور اس مرحلے پر ذرا سی چوک ان دونوں کو موت کی وادی میں دھکیل سکتی ہے۔ لہذا اب دونوں ہی محتاط ہو چکے تھے کلر نے بھی اندھا دھند پلٹ کر بھاگنے کے بجائے اب رک کر اور زمین کو اپنے مضبوط قدموں سے کھرچ کر تاک کر نشانہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ انتونیو کی تلوار کئی بار اس کے بھیجے میں پیوست ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ ان دونوں کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ لیکن دونوں میں سے کوئی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ کلر نے آخری بار اطمینان سے تمام اکھاڑے کا گھوم کر ایک لمبا چکر لگایا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھی انتونیو کو زچ کرنا اور تھکانا چاہتا ہے۔ انتونیو اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے کلر کے ساتھ گھومتا رہا۔ سورج ڈھلنے والا تھا اور اسے ہر حال میں شام ہونے سے قبل یہ مقابلہ ختم کرنا تھا ورنہ اندھیرے میں تیز مصنوعی روشنیوں کے باوجود وہ اپنے جسم کو مناسب حد تک جھکاؤ دینے میں ناکام رہ سکتا تھا کیونکہ اگر اندھیرے میں اسے بھینسے کے آخری وقت میں لی جانے والی جھکائی نظر نہ آتی تو اگلے لمحے وہ کلر کے سینگوں میں پرویا جا چکا ہوتا۔ کلر نے انتونیو کے سامنے کچھ فاصلے پر رک کر اپنے جسم کو تولا۔ انتونیو نے بھی اپنی تلوار سیدھی کر لی۔ اکھاڑے کا خوفناک شور اب دھیمی سرگوشیوں میں بدل چکا تھا۔ شاید وہ سب بھی آنے والے لمحات کو محسوس کر چکے تھے۔ ماریا زور سے چلائی۔ ''سنبھل کے انتونیو۔۔۔ یاد رکھنا۔۔۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔۔۔'' انتونیو نے ماریا کی جانب دیکھ کر ایک ہوائی بوسہ فضا میں اچھال دیا۔ بھینسے نے اپنے نتھنوں کی ہوا سے زمین کی دھول اڑائی اور زور سے زمین پر قدم مار کر وہ تیزی سے انتونیو کی جانب دوڑا۔ انتونیو نے اس لمحے اپنے حریف کی آنکھوں میں جنون کی ایک چمک سی دیکھی جیسے کلر اس سے کہہ رہا ہو کہ تم بہادر دشمن ہو۔۔۔ اور میں تمہیں موت بھی ایک بہادر دشمن کی دوں گا۔ انتونیو نے ایک ہاتھ سے تلوار اچھال کر چابک دستی سے فوراً دوسرے ہاتھ کی جانب سے اسے اپنے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے ایک بھالے کی طرح پکڑ لیا۔ کلر نے چوٹ کی بجائے بھاگتے بھاگتے برق رفتاری سے اپنے جسم کا جھکاؤ دائیں سے بائیں جانب کر دیا۔ ایک وحشی جانور کی شان کے ساتھ جنگ کا آخری وار تھا اور وہ دونوں ہی اپنا ہر آخری پینترا آزمانے کو تیار تھے۔ انتونیو کے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ دائیں ہاتھ سے تلوار کو بائیں ہاتھ میں منتقل کر سکے۔ انتونیو کا واسطہ آج تک جتنے بھی حریفوں سے پڑا تھا کلر ذہانت میں اُن سب پر بھاری تھا۔ انتونیو نے بھی اُس گولی کی رفتار سے اپنی جانب بڑھتے عفریت کو نظروں

میں سراہا" واقعی..... تم ایک اعلیٰ دشمن ہو کلر..... تمہاری موت بھی بہت اعلیٰ ہونی چاہیے..... بالکل تمہارے شایانِ شان....." ماریا نے انتونیو کو یوں اطمینان سے کھڑے دیکھا تو وہ ہذیانی انداز میں چیخی "سنبھل کر فائٹر....." لیکن انتونیو جانتا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے اب اس کے پاس دو ہی راستے تھے کہ وہ پیچھے پلٹ کر بھاگے اور اکھاڑے کی دیوار میں بنی ہوئی درزوں میں پیر جماتے ہوئے اوپر چڑھ کر اپنی جان بچا لے یا پھر وہیں کھڑے رہ کر اس ترچھے طوفانی رفتار سے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دشمن کو جھکائی دے کر اپنی تلوار سے اس کا خاتمہ کرنے کی ایک آخری کوشش کرے حالانکہ اس میں کامیابی کے امکانات اب بہت کم تھے کیونکہ کلر کا زاویہ ناقابلِ شکست تھا اور بنا اس سے ٹکرائے اسے تلوار گھونپنا ناممکن تھا۔ مگر اتنی طاقت سے ٹکرا جانے کے بعد فائٹر کا اپنا سنبھلنا ہی محال ہوتا ہے۔ پھر ایسے میں تلوار کو سنبھالے رکھنا اور پورا تول کر وار کرنا تو دور کی بات ہے۔ کلر اور انتونیو کا فاصلہ لمحوں میں ختم ہوتا جا رہا تھا تماشائی بے چینی سے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اکھاڑے کا منیجر چلایا "یہ حماقت نہ کرو انتونیو..... پلٹ جاؤ....." مگر انتونیو اپنی جگہ پر جما کھڑا اپنے دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ کلر نے اپنے جسم کی ساری طاقت اپنے قاتل سینگوں میں سموئی اور عین انتونیو کے دل کا نشانہ لیا۔ انتونیو نے آخری لمحے میں اپنے جسم کو ایک سو اسی درجے پر انتہائی جھکائی دے کر بھینسے کے جسم سے دور رکھنے کی کوشش کی اور تاک کر اپنی تلوار کلر کی دو آنکھوں کے درمیان گاڑ دی۔ اس کے ہاتھوں کا سرخ کپڑا تو پہلے ہی ہوا میں اُڑ چکا تھا لہٰذا اس کا جسم بھی کلر سے پوشیدہ نہیں تھا۔ کلر نے تکلیف سے ایک زوردار چیخ ماری اور اس کا ٹنوں وزنی جسم انتونیو سے پوری قوت سے ٹکرایا۔ انتونیو اپنی جگہ سے اچھلا اور دوسرے ہی لمحے کلر نے اُسے اپنے سینگوں میں پرو کر دو چکر دیئے اور اچھال کر دور پھینک دیا۔ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ دونوں اکھاڑے کی کچی زمین پر خون میں لت پت پڑے تھے اور دونوں کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہو رہی تھیں کلر کے نتھنوں سے خون نکل کر مٹی کو رنگین کر رہا تھا اور انتونیو کی سانس بھی اکھاڑے کی دھول اڑا رہی تھی۔ ماریہ تڑپ کر انتونیو کی جانب دوڑی۔ انتونیو اور کلر کی آنکھیں اب بھی ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں۔ انتونیو کی نظر نے کہا الوداع..... عظیم دشمن..... تم آج خوب لڑے..... کلر نے اپنی آخری سانس سینے سے نکالی..... الوداع فائٹر..... تم واقعی ایک بہادر حریف تھے..... اور میں نے بھی کوشش کی کہ تمہیں تمہارے اعزاز کے مطابق موت دوں..... الوداع انتونیو..... دونوں کی آنکھیں ایک ہی وقت میں دھیرے دھیرے لرزتی پلکوں تلے ڈوبتی گئیں۔ دور اکھاڑے کی اونچی دیواروں کے پیچھے سورج ڈوب رہا تھا اور یہاں اکھاڑے میں ان دو عظیم لڑاکوں کی زندگیاں غروب ہو رہی تھیں۔ ان دونوں میں کتنی مماثلت تھی۔ وہ دونوں عمر بھر ایک شاندار زندگی جیئے۔ سر اٹھا کر ہر دشمن کا مقابلہ کیا۔ اپنے جسموں پر لاتعداد زخموں کے تمغوں کے نشان سجائے۔ مگر کبھی ہار نہیں مانی۔ ہر جنگ کا ایک اعلیٰ اختتام کیا اور آج جب دونوں اس

اکھاڑ ۔ سمیت اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو ان دونوں کا کوئی جانشین پیچھے ان کی سلطنت اور ان کے اعزازت کا دفاع کرنے کے لیے باقی اور موجود نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی دونوں کے لاوارث یکتا شہنشاہ تھے کیونکہ عظمت کا کوئی جانشین نہیں ہوتا۔



محبتوں کے پگھلتے گلیشیر (نظم)

پھر سے رت بدل رہی ہے
پھر سے درد کا ایک پرانا موسم
ان رگوں سے چھوٹ رہا ہے
ساکت جھیلوں پر جمی برف
پھر یوں پگھل رہی ہے جیسے
کوئی چنچل کرن دھیرے سے چھو کر
انہیں ''پانی'' کہہ گئی ہو
جیسے ہم دونوں کے بچپن کا
وہ ''برف پانی'' کا کھیل......
وہ بھاگتے بھاگتے اک دوجے کو چھو کر
''برف'' کہہ کر منجمد کر دینا

اور اچانک "پانی" کہہ کر

پھر سے رواں کر دینا

یونہی جانے کتنے موسم

قطرہ قطرہ بہتے رہے

اور وقت کی برف پگھلتی گئی

جب ایک دن چپکے سے

میری محبت کا گھائل راج ہنس

تمہاری آنکھوں کی ساکت جھیل پر

اپنے پر پھیلائے آبیٹھا......

اور تم نے اپنی آنکھیں موندھ کر

اُس کا ہر زخم مندمل کر ڈالا تھا......

لیکن سب ایک سا ہمیشہ

کب......اور کہاں رہتا ہے

وقت کی تپش ایک نہ اک دن......

ہر محبت کی "برف" کو

"پانی" کر ہی دیتی ہے

محبت کے گھائل راج ہنس کو

زخم بھرنے کے بعد اُس جھیل سے

اپنی اُڑان بھر جانی ہوتی ہے

سو ہماری محبت کا راج ہنس بھی
اک انجانے دیس کی جانب اُڑ گیا......
تب سے ہر جاتی رُت یونہی
میری نسوں میں زہر بھر جاتی ہے
اور میری بصارتوں کا ہر رنگ
پھیکا پڑنے لگتا ہے
پر دل تو سدا ہی نادان ٹھہرے......
سو میرا دل بھی کبھی جان نہیں پایا
کہ محبتوں کے پگھلتے گلیشیر
پھر کسی کے چھو کر کہنے سے
کبھی ''برف'' نہیں ہو پاتے
اور
محبتوں کے راج ہنس کبھی
واپس لوٹ کر نہیں آتے......

(ہاشم ندیم خان)